خاکدان
(شعری مجموعہ)
ظہیر احمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(شعری مجموعہ)

ظہیر احمد

فہرست

پیش لفظ

یہ شعری مجموعہ پچھلی چار دہائیوں پر پھیلے میرے شعری سفر کا پہلا سنگِ میل ہے۔ اس سفر کے دوران کئی نشیب و فراز آئے۔ نو آموزی کے دور میں شعری نشستوں اور مشاعروں میں بھی شرکت کی۔ کچھ دیر تک حیدرآباد کی ادبی سرگرمیوں کا حصہ بھی بنا لیکن پھر سلسلۂ تعلیم اور پیشہ ورانہ ذمہ داریوں نے ترجیحات بدل ڈالیں۔ میڈیکل تعلیم ختم کرنے کے فوراً بعد سے فکرِ معاش کا جو انتھک سلسلہ شروع ہوا تو یوں سمجھئے کہ پھر کسی بھی شہر میں قدم زیادہ دیر تک جم نہ سکے۔ کششِ آب ودانہ ۱۹۹۱ء میں امریکا کھینچ لائی اور پھر یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ اس دوران یوں بھی ہوا کہ لکھنا ترک کر دیا اور کئی سال تک ایک مصرع بھی موزوں نہ ہوا۔ اور درمیان میں کچھ ایسے سال بھی آئے کہ رہوارِ قلم ہوا کے دوش پر سوار رہا۔ اگرچہ شمالی امریکا میں اردو شعر و ادب کے حوالے سے اچھی خاصی سرگرمیاں پائی جاتی ہے لیکن بوجوہ میں ان سے دور رہا ہوں اور اپنی شعر خوانی کو ایک مختصر سے حلقۂ احباب تک ہی محدود رکھا ہے۔ اگرچہ یہ بات طے ہے کہ ادبی ماحول نہ صرف قلم کے لئے مہمیز کا کام کرتا ہے بلکہ نقد و نظر کا وہ اہم عنصر بھی فراہم کرتا ہے کہ جس کی روشنی میں فن جلا پاتا ہے لیکن اس تمام خسارے کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ ادبی سرگرمیوں سے دوری کا ایک مثبت اثر یہ ہوا کہ مجھے شاعری برائے شاعری جیسی کسی صورتحال سے واسطہ نہیں پڑا اور شعر گوئی کے محرکات خالصتاً ذاتی اور داخلی نوعیت کے رہے۔

کئی سال پہلے کشاکشِ روزگار نے ذرا مہلت دی اور گرانیٔ روز و شب ذرا کم ہونے لگی تو میں انٹرنیٹ کی ادبی دنیا سے متعارف ہوا۔ سن ۲۰۱۵ میں اردو ویب سے میری آشنائی ہوئی اور یہاں میں نے اہلِ علم و ہنر اور اربابِ ذوق کا ایک بڑا حلقہ دریافت کیا۔ یہیں پہلی دفعہ میں نے

اپنا کلام انٹرنیٹ پر شائع کرنا شروع کیا اور صاحبانِ ذوق کے مشورے پر ہی اس ای بک کی اشاعت کا فیصلہ کیا۔ اپنی شاعری کے بارے میں صرف اتنا کہوں گا کہ میرے سخن ہائے کم مایہ اس قابل تو نہیں کہ اردو کے شعری سرمائے میں کہیں کوئی جگہ پاسکیں لیکن یہ ضرور ہے کہ یہ شکستہ سے الفاظ دل سے نکلے ہوئے ہیں اور دل سے نکلی ہوئی کسی بھی آواز کی طرح ان کی سچائی اپنے زمان و مکان میں اپنی جگہ معتبر ہے۔ اور یہی خیال اس مجموعے کی اشاعت کے پیچھے کار فرما ہے۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف!

منتخب غزلوں اور نظموں پر مشتمل اس مجموعے میں کلام کو دہائیوں پر تقسیم کر کے زمانی اعتبار سے اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ تازہ ترین اشعار مجموعے کے آخر میں آگئے ہیں۔ اس ای بک کے پبلشر محترمی اعجاز عبید صاحب کا احسان مند ہوں کہ انہوں نے مسودے کو بصد غور و توجہ دیکھ کر اپنے گراں قدر مشوروں سے نوازا۔ اعجاز عبید جو اردو ویب پر الف عین کے نام سے جانے جاتے ہیں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ برقی کتب کی اشاعت کے حوالے سے اردو کے لئے ان کی خدمات کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ آخر میں شاعرِ خوش بیان محمد احمد کا شکریہ بھی واجب ہے کہ انہوں نے اردو ویب پر موجود منتشر کلام کو یکجا کر کے ابتدائی مسودہ ترتیب دیا۔ اردو ویب کے مدیر اعلیٰ تابش صدیقی کہ شعر و ادب کا اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں ان کا بھی ممنون ہوں کہ انہوں نے غزلوں کے انتخاب میں مدد دی۔ اور سب سے آخر میں ایک حرفِ تشکر اردو محفل کے ان تمام خوش ذوق قارئین کے لئے کہ جنہوں نے میرے کلام کو اپنے تبصروں اور قیمتی آراء سے نوازا اور حوصلہ افزائی فرمائی۔ ان کے محبتانہ مطالبوں کی بدولت ہی یہ مجموعہ وجود میں آسکا ہے۔

ظہیرؔ احمد

۱۵ نومبر ۲۰۲۰ء

وسکانسن (ریاستہائے متحدہ امریکا)

(۱۹۹۰_۱۹۹۹)

اک بادباں شکستہ طغیانیوں میں دیکھا
بے حوصلہ سفینہ کم پانیوں میں دیکھا

اتنا قریب تجھ کو پایا نہ محفلوں میں
جتنا قریب تجھ کو ویرانیوں میں دیکھا

اُن مشکلوں سے بہتر آسانیاں نہیں یہ
جن مشکلوں کو میں نے آسانیوں میں دیکھا

کیسے کھلوں میں اُس پر ، اِس زندگی کو جس نے
بس خواہشوں میں سوچا ، من مانیوں میں دیکھا

ملتا نہیں کہیں اب چشمِ جہاں بیں کو
جو روپ زندگی کا نادانیوں میں دیکھا

(۱۹۹۰)

لَو چراغوں کی بہت کم ہے خدا خیر کرے
بادِ صرصر بڑی برہم ہے خدا خیر کرے

سرِ تکیہ کوئی ہمدم بھی نہیں آج کی شب
آج تو درد بھی پیہم ہے خدا خیر کرے

لذّتِ دردِ نہاں سے نہیں واقف جو ذرا
وہ مرا چارہ گرِ غم ہے خدا خیر کرے

خوئے لغزش بھی نہیں جاتی مرے رہبر کی
جادۂ راہ بھی پُرخم ہے خدا خیر کرے

جانے اغیار کی سازش ہے یا اپنوں کا ستم
شہرِ یاراں کا جو عالَم ہے خدا خیر کرے

کوئے قاتل کی رہی ہے جو کبھی خاک ظہیرؔ
وہ مرے زخم کا مرہم ہے خدا خیر کرے

(۱۹۹۵)

عذابِ ہجرتِ پیہم سنبھلنے دے
حصارِ بے مکانی سے نکلنے دے

غبارِ بے سروسامانی پردہ رکھ
قبائے بے لباسی تو بدلنے دے

ہوائے شہر غربت اک ذرا دھیرے
چراغِ شامِ تنہائی کو جلنے دے

دیارِ اجنبی کے منجمد لہجے
سکوتِ گوشۂ جاں میں پگھلنے دے

فشارِ احتیاجِ زندگی مجھ کو
کبھی تو کنجِ غفلت میں بہلنے دے

جنونِ رخصتِ تازہ مجھے اس بار
جہاں کچھ بھی نہیں اُس سمت چلنے دے

(۱۹۹۶)

زنجیر کس کی ہے کہ قدم شاد ہوگئے
بیڑی پہن کے لگتا ہے آزاد ہوگئے

جتنے بھی حرفِ سادہ ہوئے اُس سے منتسب
ہم رنگِ نقشِ مانی و بہزاد ہوگئے

سنگِ سخن میں جوئے معانی کی جستجو!
گویا قلم بھی تیشۂ فرہاد ہوگئے

زندہ رہے اصولِ ضرورت کے ماتحت
جب چاہا زندگی نے ہم ایجاد ہوگئے

خود بیتی لگتی ہے مجھے ہر اک کی داستان
لگتا ہے ان گنت مرے ہمزاد ہوگئے

بیداد گر ملے سبھی ہم طرز و ہم خیال
سارے ستم زبانی ہمیں یاد ہوگئے

-ق-

آشوبِ احتیاج یہ کیسا ہے کیا کہیں
صبر و رضا کے لہجے بھی فریاد ہوگئے

آب و ہوائے شہر ہوس کچھ نہ پوچھیے
برباد وہ ہوئے کہ جو آباد ہوگئے

(۱۹۹۶)

ترکِ تعلقات کا وعدہ نہ کر سکیں
چاہیں بھی ہم اگر کبھی ایسا نہ کرسکیں

سر سے تمھارے عشق کا سودا نہ جا سکے
تا عمر ہم کسی کو بھی اپنا نہ کرسکیں

چلتے رہیں سدا یونہی رستوں کی دھوپ میں
یادوں کے سائبان بھی سایا نہ کرسکیں

مصروفیت تو ہو مگر ایسی نہیں کہ اب
بزمِ خیال بھی کوئی برپا نہ کرسکیں

(۱۹۹۶)

منظر سے ہٹ گیا ہوں میں ، ایسا نہیں ابھی
ٹوٹا تو ہوں ضرور ، پہ بکھرا نہیں ابھی

وہ بھی اسیر فتنۂ جلوہ نمائی ہے
میں بھی حصارِ ذات سے نکلا نہیں ابھی

آسودۂ خمار نہیں مضمحل ہے آنکھ
جو خواب دیکھنا تھا وہ دیکھا نہیں ابھی

داغِ فراقِ یار کے پہلو میں یاس کا
اک زخم اور بھی ہے جو مہکا نہیں ابھی

نومیدیِ قرار کے ماتھے پہ درد کا
اک نقش اور بھی ہے جو نکھرا نہیں ابھی

مل تو گیا ہے شوق کو رازِ دوامِ عشق
لیکن طلب کی راہ پر آیا نہیں ابھی

سود و زیانِ کارِ وفا یاد ہے مجھے
لیکن ترے حساب میں لکھا نہیں ابھی

کچھ دن ابھی رہیں گے یہ ملنے کے سلسلے
جانا تمہارے شہر سے ٹھہرا نہیں ابھی

سہتے رہو ظہیرؔ ابھی تہمتِ حیات
مقتل مقامِ زیست سے اونچا نہیں ابھی

(۱۹۹۶)

مرہموں کی آس میں

زخم ہائے جاں لئے مرہموں کی آس میں
کب سے چل رہا ہوں میں دہرِ ناسپاس میں
چلتے چلتے خاک تن ہوگیا ہوں خاک میں
تار ایک بھی نہیں اب قبا کے چاک میں
دل نشان ہوگیا ایک یاد کا فقط
رہ گئی ہے آنکھ میں ایک دید کی سکت
زہر جو ہوا میں تھا آگیا ہے سانس میں
ذہن میں گرہ جو تھی وہم کے لباس میں
پھانس بن کے درد کی شاہ رگ میں گڑ گئی
کرب اِس قدر سوا ، یاد ماند پڑ گئی
ٹیسیں روز اٹھتی ہیں درد کے پگھلنے تک
درد جانے کتنے ہیں حالِ دل سنبھلنے تک
اور کتنا روؤں اب ، اشک خوں تو ہو گئے
رنگ وحشتوں کے سب ، ہاں جنوں تو ہوگئے
دشتِ ہجر کی ہوا داؤ سارے چل چکی
اور کتنا چلنا ہے ، رات کتنی ڈھل چکی

تارے کتنے ٹوٹیں گے تیرگی کے چھٹنے تک
ناشکیب و نا رسا بخت کے پلٹنے تک
مہر کے نکلنے میں قہر کتنے رہتے ہیں
کاسۂ جدائی میں زہر کتنے رہتے ہیں
درد کتنے باقی ہیں لا علاج ہونے میں
اشک کتنے باقی ہیں تجھ سے مل کے رونے میں

(۱۹۹۶)

معیار ہے سخن تو حوالہ نہ دیکھئے
شاخِ ہنر کو دیکھئے ، شجرہ نہ دیکھئے

شاید اسی طرح مجھے پہچان جائیں آپ
لہجے کا رنگ دیکھئے ، چہرہ نہ دیکھئے

رستے ہیں میرے گھر کے محبت کے راستے
دل کی کتاب کھولئے ، نقشہ نہ دیکھئے

سینہ ہے داغ داغ مگر دل تو صاف ہے
گھر دیکھئے جناب ، علاقہ نہ دیکھئے

دیواریں پڑھ رہے ہیں بس اپنی گلی کی آپ
اخبار پورا پڑھئے ، تراشہ نہ دیکھئے

سائے تو گھٹتے بڑھتے ہیں سورج کیساتھ ساتھ
قامت کو اپنی ناپئے ، سایا نہ دیکھئے

ہو عزم آہنی تو ہمالہ بھی زیر ہے
رکھئے نظر فراز پہ تیشہ نہ دیکھئے

دیوار و در کے پردے ہٹا کر کبھی کبھی
جانب خدا کی دیکھئے ، کعبہ نہ دیکھئے

بجھنے لگی ہیں شہرِ نگاراں کی رونقیں
کچھ کیجئے ظہیرؔ ، تماشہ نہ دیکھئے

(۱۹۹۷)

کس طور اُن سے آج ملاقات ہم کریں
گریہ کریں کہ شکوۂ حالات ہم کریں

کچھ دیر کو سہی ، پہ ملے درد سے نجات
کچھ دیر کو تو دل کی مدارات ہم کریں

مانا کہ اُن کی بزم میں ہے اذنِ گفتگو
اتنا بھی اب نہیں کہ سوالات ہم کریں

جب تک ہیں درمیان روایات اور اصول
دشمن سے کیسے ختم تضادات ہم کریں

وقتِ عمل ہے دوستو ! اب کیسا انتظار
آتے رہیں گے لوگ شروعات ہم کریں

سجدے میں سر جھکے ہیں مگر دل میں وسوسہ
الحمد ہم کہیں کہ مُناجات ہم کریں

شکوے سبھی لبوں پہ زمانے کے ہیں ظہیرؔ
آؤ ذرا سا ذکرِ عنایات ہم کریں

(۱۹۹۷)

تمھاری گلیوں میں پھر رہے تھے اسیر درد و خرابِ ہجراں
ملی اجازت تو آگئے پھر حضورِ عشق و جنابِ ہجراں

وہ ملنے جلنے کی ساری رسمیں دراصل فرقت کے سلسلے تھے
گئے دنوں کی رفاقتوں میں چھپا ہوا تھا سرابِ ہجراں

مٹے نہیں ہیں حروفِ ظلمت ، ابھی گریزاں ہے صبحِ برات
ابھی پڑھیں گے کچھ اور بھی ہم دیارِ غم میں کتابِ ہجراں

وفا شعاری کے مرحلوں سے پلٹ کے جب کامیاب آئے
ہوا مقرر نئے سرے سے شکیبِ دل پر نصابِ ہجراں

یہ تیرے میرے لہو کی ساری کثافتوں کو نتھار دے گا
ہماری راہوں کے درمیاں میں رواں دواں ہے جو آبِ ہجراں

وہ دن بھی تھے جب مرا تعارف غزال چشموں کے زیبِ لب تھا
اور آج ان کی ہر انجمن سے ملا ہوا ہے خطابِ ہجراں

ہمیں امیدِ جزا ہے اُن سے ، اسی لئے تو ظہیرؔ ہم نے
غزل کے شعروں میں لکھ دیا ہے شمارِ درد و حسابِ ہجراں

(۱۹۹۷)

ضبطِ غم توڑ گئی بھیگی ہوا بارش میں
دل کہ مٹی کا گھروندا تھا گرا بارش میں

شادیء مرگ کو کافی تھا بس اک قطرۂ آب
شہرِتشنہ تو اجڑ سا ہی گیا بارش میں

روشنی دل میں مرے ٹوٹ کے رونے سے ہوئی
اک دیا مجھ میں عجب تھا کہ جلا بارش میں

لاج رکھ لی مرے پندار کی اک بادل نے
میرے آنسو نہ کوئی دیکھ سکا بارش میں

کھیت پیاسے تھے اِدھر ، اور اُدھر کچے مکان
میں نے دیکھا تو نظر آیا خدا بارش میں

(۱۹۹۸)

قطعہ

اِس دور کے گھور اندھیرے میں اک یاد سہارا دیتی ہے
جب بھی میں بھٹکنے لگتا ہوں منزل کا اشارہ دیتی ہے
طوفاں کے تھپیڑے سہتا ہوں اور سوچتا ہوں کب آئیگی
وہ موجِ اماں جو آوارہ کشتی کو کنارا دیتی ہے

(۱۹۹۸)

اے وقت ذرا تھم جا ، یہ کیسی روانی ہے
آنکھوں میں ابھی باقی اک خوابِ جوانی ہے

کیا قصہ سنائیں ہم اس عمرِ گریزاں کا
فرصت ہے بہت تھوڑی اور لمبی کہانی ہے

اک راز ہے سینے میں ، رکھا نہیں جاتا اب
آکر کبھی سن جاؤ اک بات پرانی ہے

سچے تھے ترے وعدے ، سچے ہیں بہانے بھی
بس ہم کو شکایت کی عادت ہی پرانی ہے

جو کچھ بھی کہا تم نے ، تم کو ہی خبر ہوگی
ہم نے تو سنا جو کچھ دنیا کی زبانی ہے

گزری جو بنا تیرے اُس عمر کا افسانہ
ہونٹوں کی خموشی ہے ، آنکھوں کا یہ پانی ہے

اے یادِ شبِ الفت ! کچھ اور تھپک مجھ کو
پلکوں پر ابھی باقی دن بھر کی گرانی ہے

امید کی خوشبو ہے ، یادوں کے دیئے روشن
ہر وقت تصور میں اک شام سہانی ہے

(۱۹۹۹)

ڈرتا ہوں کسی دن نظروں کا دھوکا نہ کہیں ہو جاؤ تم
تعبیر سمجھتا ہوں تم کو ، سپنا نہ کہیں ہو جاؤ تم

ہر روز بدلتے ہو منزل ، ہر سمت میں چلتے ہو کچھ دیر
خواہش کے سفر میں رستے کا حصہ نہ کہیں ہو جاؤ تم

افسانے کچھ اپنے عنواں کے برعکس بھی نکلا کرتے ہیں
چہروں کی کتابیں پڑھتے ہو، ضایع نہ کہیں ہو جاؤ تم

جو آگ چھپائے پھرتے ہو ، رکھ دے نہ سبھی کچھ پگھلا کر
پتھر ہو بظاہر اندر سے ، لاوا نہ کہیں ہو جاؤ تم

چھپ کر ہی سہی رویا تو کرو ، یہ ضبط بھی اتنا ٹھیک نہیں
بے آب نہ رکھو دشتِ انا ، صحرا نہ کہیں ہو جاؤ تم

یہ قربتیں اتنی ٹھیک نہیں ، ہر گام نہ میرے ساتھ رہو
پرتَو نہ سمجھ بیٹھوں اپنا ، سایا نہ کہیں ہو جاو تم

دل میں جو خلش ہے ماضی کی ، لفظوں میں اسے مت دہراؤ
ایسا نہ ہو اے جانانِ غزل ، افسانہ کہیں ہو جاؤ تم

ہر لفظ علامت ہے میرا ، ہر بات معمہ ہے میری
اک راز بنا ہوں اس لئے میں ، افشا نہ کہیں ہو جاؤ تم

آتی ہے نظر جو کاغذ پر ، ہے مختلف اس سے دنیا ظہیرؔ
ڈرتا ہوں کتابیں پڑھ پڑھ کر تنہا نہ کہیں ہو جاؤ تم

(۱۹۹۹)

ہوائے مہر و محبت سوادِ جاں سے چلے
فصیلِ درد گرائے جہاں جہاں سے چلے

ہوا ہے شہر میں دستورِ مصلحت کا نفاذ
کوئی تو رسمِ جنوں بزمِ عاشقاں سے چلے

وصال و ہجر کے موسم گزر چکے ہیں سبھی
سو آج ہم بھی تری بزمِ امتحاں سے چلے

وہ مرحلے تری جانب جو طے کئے تھے کبھی
بُھلا کے ہم تری خاطر لو درمیاں سے چلے

فرازِ دار ، نشیبِ چمن ، حصارِ جنوں
یہ سلسلے تری جانب کہاں کہاں سے چلے

(۱۹۹۹)

تری زلف سمجھی اشارہ ہوا کا
بہت اوج پر ہے ستارہ ہوا کا

کماں کھنچ گئی ہے دھنک کی فضا میں
شعاعوں نے رستہ نکھارا ہو ا کا

چراغوں سے ہے ربط فانوس جیسا
تو پھولوں سے رشتہ ہمارا ہوا کا

ملا یوں توازن ہمیں گردشوں سے
پرندے کو جیسے سہارا ہوا کا

خزاں زاد پتّوں پہ لکھ کر فسانے
لو آیا ہے تازہ شمارہ ہوا کا

وہ خاشاک صورت فضاؤں میں گم ہیں
جو چُھونے چلے تھے کنارہ ہوا

عجب حوصلہ اک دیا روشنی نے
دیا کر رہا ہے نظارہ ہوا کا

-ق-

زمینوں میں وحشی بگولے کی صورت
فلک چڑھ رہا ہے منارہ ہوا کا

قبائیں سنبھالو اے دستار والو!
کہ گلیوں میں ہے اب اجارہ ہوا کا

پلٹ جاتے ہیں بادلوں کے سفینے
مخالف ہے مٹی کے دھارا ہوا کا

-

نہیں بس میں شعلوں کے اتنی تباہی
ضرور اُن کو ہوگا سہارہ ہوا کا

دیئے بجھ گئے تو سوا ہوگیا حبس
نہ لے نام کوئی دوبارہ ہوا کا

(۱۹۹۹)

دو دل جلے باہم جلے تو روشنی ہوئی
کچھ وہ جلا ، کچھ ہم جلے تو روشنی ہوئی

اتنا بڑھا کچھ حبسِ جاں کہ بجھ گئے خیال
کچھ دَر کھلے کچھ غم جلے تو روشنی ہوئی

کل رات گھر کی تیرگی دل میں اُتر گئی
دو دیدۂ پُرنم جلے تو روشنی ہوئی

اُلجھے ہوئے احساس نے دھندلا دیا شعور
جذبوں کے پیچ و خم جلے تو روشنی ہوئی

رستے سبھی تھے بے نشاں اپنی تلاش کے
انجم نما خود ہم جلے تو روشنی ہو ئی

اک عمر سے بے نور تھے زخموں کے سب چراغ
کچھ روز بے مرہم جلے تو روشنی ہوئی

(۱۹۹۹)

ازراہِ دلبری ہمیں آنے دو اپنے پاس
کچھ دیر کو سہی ہمیں آنے دو اپنے پاس

رسموں کے زَر محل میں مقید ہو دیر سے
در کھولو اب کوئی ہمیں آنے دو اپنے پاس

احساس کے ڈگر سے اُتارو خیال میں
ایسے کبھی کبھی ہمیں آنے دو اپنے پاس

مل بیٹھ کر کریں گے علاجِ غمِ حیات
اے جانِ زندگی ہمیں آنے دو اپنے پاس

شاید تمہارے شہر سے گزریں نہ پھر کبھی
پھیرا ہے آخری ہمیں آنے دو اپنے پاس

کسبِ ہنر و اکلِ ضرورت کے سلسلے
طے ہوچکے سبھی ہمیں آنے دو اپنے پاس

مشعل بکف ہیں کب سے فصیلوں پہ منتظر
لائے ہیں روشنی ہمیں آنے دو اپنے پاس

(۱۹۹۹)

ہجراں میں دربدر ہوئے ہم قربتوں کے بعد
دیدی گئی زمین ہمیں جنّتوں کے بعد

چھینے گا مجھ سے اور غمِ روزگار کیا!
دامن میں کیا بچا ہے بھلا حسرتوں کے بعد

ہو آئے اُس گلی میں تماشہ بنے ہوئے
فرصت ملی تھی آج بڑی مدتوں کے بعد

معمارِ ارضِ نو بھی وہی لوگ تھے جنہیں
اک مشتِ خاک بھی نہ ملی ہجرتوں کے بعد

تعمیرِ نو میں شہر کی اتنا رہے خیال
ٹوٹی فصیل بھی ہے شکستہ چھتوں کے بعد

سفّاک دن ہیں گھات میں بیٹھے ہوئے ظہیرؔ
اک حملۂ غنیم ہے اِن جگ رتوں کے بعد

(۱۹۹۹)

(۲۰۰۰_۲۰۱۰)

غم نیا تھا تو نیا عہدِ وفا رکھنا تھا
حوصلہ غم سے بہرحال سوا رکھنا تھا

کیسے اُس پر میں مقدر کی سیاہی رکھتا
جس ہتھیلی پہ مجھے رنگِ حنا رکھنا تھا

ایسا کیا ڈر تھا بھلا تیز ہوا سے لوگو!
بجھ گئیں شمعیں تو آنکھوں کو کُھلا رکھنا تھا

ہم نہ خوشبو تھے ، نہ آواز ، نہ بادل کوئی
پھر ہواؤں سے تعلق بھلا کیا رکھنا تھا

اس قدر بھی تو نہیں رکھتے زمیں کو بنجر
دل کے ویرانے میں اک نخلِ انا رکھنا تھا

(۲۰۰۰)

طوفان میں جزیرہ ملا ہے ، زمیں ملی
پانی کی قید سے تو رہائی نہیں ملی

ابرِ رواں کے پیچھے چلے آئے ہم کہاں
بارش ہوئی تو مٹی کی خوشبو نہیں ملی

دوزخ سمجھ کے چھوڑی جو تپتی ہوئی زمین
چھالے پڑے تو پاؤں کو ٹھنڈک وہیں ملی

جھوٹی انا کا تخت ، زرِ مصلحت کا تاج
جب کھو دیئے تو دولتِ صدق و یقیں ملی

تھکتی نہیں ہے سجدۂ فرعونِ وقت سے
موسیٰ کے حامیوں کو یہ کیسی جبیں ملی

پردیس آ کے مر گئی دریا دلی ظہیرؔ
پانی کہیں کا تھا جسے مٹی کہیں ملی

(۲۰۰۰)

سوچا ہے یہ ہم نے تمھیں سوچا نہ کریں گے
ہم تم کو تصور میں بھی رُسوا نہ کریں گے

گر تم کو بچھڑنے پہ نہیں کوئی ندامت
مل جاؤ تو ہم بھی کوئی شکوہ نہ کریں گے

رستے میں اگرچہ ہیں ہواؤں کے نشیمن
ہم مشعلِ خود داری کو نیچا نہ کریں گے

ہاں ذوقِ سفر بڑھ کے ہے منزل کی ہوس سے
ہم کھو بھی گئے تو کوئی شکوہ نہ کریں گے

وہ حرفِ سخن جو تری نسبت سے ملا ہے
اس حرف کو بازار میں رسوا نہ کریں گے

اپنی ہی بغاوت سے نبٹنا نہیں ممکن
یہ دل نہیں چاہے گا تو وعدہ نہ کریں گے

تڑپیں گے نہ بیکار کسی فکرِ عبث میں
احساس کی دولت کو یوں ضایع نہ کریں گے

(۲۰۰۰)

اُجرتِ آبلہ پائی بھی نہ دے گا سورج
ہمسفر بن کے اگر ساتھ چلے گا سورج

دن نکلنے کا کرشمہ نہ سمجھنا آسان
اَن گنت ٹوٹیں گے تارے تو بنے گا سورج

سائباں جیسا بھی سر پر ہے غنیمت ہے بہت
سر اٹھاؤ گے تو آنکھوں میں چُبھے گا سورج

اپنی تابش پہ جنہیں ناز ہے اُن سے کہہ دو
شام جب ہوگی تو اُن پر بھی ڈھلے گا سورج

سائے کی چاہ میں یوں راہ بدلنے والو!
تم جہاں جاؤ گے سر پر ہی رہے گا سورج

روشنی میں ہے بڑا ظرف ، نہ پچھتاؤ ظہیرؔ
سینہ کھولو گے تو پھر آن بسے گا سورج

(۲۰۰۰)

آرزوؤں کا نشانہ ہوگیا
دل مرا آخر دوانہ ہوگیا

رہ گئی تھی اک حقیقت آخری
عشق بھی آخر فسانہ ہوگیا

خواب سے نکلا تو کیا دیکھا کہ وہ
خواب ہی میرا پرانا ہو گیا

آئنہ چہرے مقابل ہی نہیں
خود کو دیکھے اک زمانہ ہوگیا

بجھ گیا ہے دل سرائے کا دیا
کارواں شاید روانہ ہوگیا

راکھ ہوکر ہی نہیں دیتا ظہیرؔ
جلتے جلتے اک زمانہ ہوگیا

(۲۰۰۰)

تری نظر نے مرے قلب و جاں کے موسم میں
یقیں کے رنگ بھرے ہیں گماں کے موسم میں

زکوٰۃِ درد ہے واجب متاعِ الفت پر
حسابِ غم کرو سود وزیاں کے موسم میں

نہ اب تلاشِ بہاراں ، نہ ڈر خزاؤں کا
ٹھہر گیا ہے چمن درمیاں کے موسم میں

وہ انتظار کا موسم بہت غنیمت تھا
بڑھی ہے تشنگی ابرِ رواں کے موسم میں

حلیف سب تہی دامانِ جستجو نکلے
اکیلے ہم چلے کارِ گراں کے موسم میں

مرے وطن میں پنپتا نہیں گلِ امید
کوئی تو بات ہے آخر یہاں کے موسم میں

ہنر نصیب خدا رکھے دستِ ہجرت کو
کہاں کے پھول کھلائے کہاں کے موسم میں

سخن ظہیرؔ بناؤ خیالِ پنہاں کو
خموشی جرم ہے لفظ و بیاں کے موسم میں

(۲۰۰۱)

تمام رنگ وہی ہیں ترے بگڑ کر بھی
اے میرے شہر تُو اجڑا نہیں اجڑ کر بھی

ہیں آندھیاں ہی مقدر تو پھر دعا مانگو
شجر زمین پر اپنی رہیں اُکھڑ کر بھی

ہم ایسی خاک ہیں اس شہر زرگری میں جسے
بدل نہ پائے گا پارس کوئی رگڑ کر بھی

ملا ہے اب تو مسلسل ہی روئے جاتا ہے
وہ ایک شخص جو ہنستا رہا بچھڑ کر بھی

عجب مقام ہے یہ ، وقت میں نہیں برکت
پہاڑ جیسا لگے دن مجھے سکڑ کر بھی

دیا گیا یہ تاثر کہ ہم بھی ہیں آزاد
ہمیں اُڑایا گیا جال میں جکڑ کر بھی

یہ کون لوگ ترے ساتھ چل رہے ہیں ظہیرؔ
اکیلے لگتے ہو ہر ہاتھ کو پکڑ کر بھی

(۲۰۰۱)

نیم در نیم ہوا ، ریت میں سوکھا دریا
آتے آتے مری بستی ہوا صحرا دریا

اپنی مٹی میں گُہر اتنے کہاں سے آئے
ایسے لگتا ہے یہاں سے کبھی گزرا دریا

ایک دو روز کی بارش سے نہیں کچھ ہونا
پیاسی مٹی کی ضرورت تو ہے بہتا دریا

برف زاروں میں شب و روز جلا کر اپنے
قطرہ قطرہ میں نے پگھلا کے بنایا دریا

۔ق۔

باندھ لو بند شراکت کے رواداری کے
روک لو روٹھ نہ جائے کہیں چلتا دریا

یہ تو املاک ہے سبزے کی ، گلوں کی جاگیر
لڑنا کیسا کہ نہ تیرا ہے نہ میرا دریا

یہ تو بادل کی وراثت ہے ، زمیں کا صدقہ
جتنا تقسیم ہو اُتنا ہے یہ اچھا دریا

اے مرے آبِ وطن تجھ کو دعا پیاسوں کی
تیری موجوں کی روانی رہے دریا دریا

(۲۰۰۱)

قلب ہوجائے جو پتھر تو بشر پتھر کا
پھر تو ہر آدمی آتا ہے نظر پتھر کا

سنگباری ہوئی اتنی کہ شرر ہوگیا خون
کچھ تو ہونا ہی تھا آخر کو اثر پتھر کا

عشقِ بینا کی عنایت ہے یہ ترتیبِ صفات
آئنہ چہرہ ، بدن پھول ، جگر پتھر کا

کارِ شیشہ گری نازک سا ہے بالائے سطح
زیرِ شیشہ ہے وہی کام مگر پتھر کا

یا تو رستے کی رکاوٹ یا کسی سر کا نصیب
یعنی ٹھوکر سے سروں تک ہے سفر پتھر کا

پہلے گھڑتا ہے خدا ، پھر وہی تیشے بھی سبھی
آزرِ عصر کے ہاتھوں میں ہنر پتھر کا

دشمنوں کو ہے کھلی دعوتِ شب خون ظہیرؔ
کانچ کی اپنی فصیلیں ہیں ، نگر پتھر کا

(۲۰۰۱)

بے غرض کرتے رہو کام محبت والے
خود محبت کا ہیں انعام محبت والے

لفظ پھولوں کی طرح چن کر اُسے دان کرو
اُس پہ جچتے ہیں سبھی نام محبت والے

خود کو بیچا تو نہیں میں نے مگر سوچوں گا
وہ لگائے تو سہی دام محبت والے

دل کی اوطاق میں چوپال جمی رہتی ہے
ملنے آتے ہیں سرِ شام محبت والے

غم کسی کا بھی ہو دیتے ہیں جگہ پہلو میں
دل بڑا رکھتے ہیں ناکام محبت والے

لوگ اندر سے یہ ہوتے ہیں بڑے عالی شان
ویسے لگتے ہیں بہت عام محبت والے

(۲۰۰۱)

آ کر قریب دیکھو نظاروں کے آس پاس
پت جھڑ چھپے ہیں کتنے بہاروں کے آس پاس

اب تک بھٹک رہے ہیں سرابوں کے بیچ میں
منزل کے پُرفریب اشاروں کے آس پاس

مایوسی اُگ رہی ہے جھلستی زمین پر
آکاش چھونے والے چناروں کے آس پاس

دریا ہنر کے ریگِ ضرورت میں کھو گئے
صحرا کھڑے ہیں پیاسے کناروں کے آس پاس

پانی ہمارے دیس کا بے فیض ہوگیا
سبزہ جلا ہوا ہے پھواروں کے آس پاس

پاتال مفلسی کے ترستے ہیں دھوپ کو
اونچی حویلیوں کی قطاروں کے آس پاس

سوتی ہے بے گھری ابھی خیمے میں رات کے
بھوکا بدن بچھا کے دواروں کے آس پاس

چنگاریوں کے جگنو پکڑنے چلے ہیں دوست
ریشم کا جال لے کے شراروں کے آس پاس

دنیا سمجھ رہی ہے جسے کہکشاں ظہیرؔ
تاریکیوں کے گھر ہیں ستاروں کے آس پاس

(۲۰۰۱)

ضربِ تیشہ سے یوں اعجاز کی صورت جاگے
سینۂ سنگ سے اک موم کی مورت جاگے

ٹوٹ جائے مرے مولا یہ جمودِ شب تار
کوکبِ بخت چمک جائے مہورت جاگے

کاش پڑ جائے مرے غم پہ ہُما کا سایا
شعلۂ درد سے عنقا کسی صورت جاگے

خواہشِ حرفِ ستائش کو تھپک دو ورنہ
بن کے اکثر یہ نمائش کی ضرورت جاگے

بے غرض ہو جو تعلّق تو کبھی دل میں ظہیرؔ
نفرتیں شور مچائیں نہ کدُورت جاگے

(۲۰۰۱)

وہیں تو عشق رہتا ہے

جہاں ہونے نہ ہونے کی حدیں آپس میں ملتی ہیں
جہاں غم گیت گاتے ہیں ، جہاں ہر درد ہنستا ہے
وہیں ہے گھر محبت کا ، وہیں تو عشق رہتا ہے
جہاں حدِ نظر تک نیلگوں گہرے سمندر کے
سنہری ساحلوں پر دھوپ کوئی نام لکھتی ہے
ہوا کی موج بکھرے بادلوں سے رنگ لے لے کر
شفق کی زرد تختی پر گلابی شام لکھتی ہے
جہاں اقرار وپیماں کے گھنے شیشم تلے سورج
نئے اک دن کی خاطر تیرگی کے وار سہتا ہے
جہاں اک آس کی خوشبو میں لپٹا یاس کا سایہ
کسی کی نظم لکھتا ہے ، کسی کے شعر کہتا ہے

اداسی جب کبھی دل پر کمندیں ڈال دیتی ہے
تھکن جب دھڑکنوں میں نا امیدی گھول دیتی ہے
تو اُس لمحے دبے پاؤں کسی احساس کا پیکر
قریب آکر بجھی آنکھوں پہ رکھ کر ہاتھ پیچھے سے
دبی سرگوشیوں کے نرمگیں لہجے میں کہتا ہے

"یہ غم میری امانت ہے ، تم اِس سے ہار مت جانا
تمہیں میری قسم دیکھو کبھی اُس پار مت جانا
جہاں ہونے نہ ہونے کی حدیں آپس میں ملتی ہیں
جہاں کوئی نہیں بستا ، جہاں کوئی نہیں رہتا"

پلٹ کر دیکھئے اُس پل تو کوئی بھی نہیں ہوتا
بس اک موہوم سی آہٹ اور اک مانوس سی خوشبو
فضا میں جیسے بکھری ہو ، ہوا جیسے مہکتی ہو
تبسم کی چنبیلی اور ترنم کے گلابوں سے
ڈھکے ٹیلوں کے دامن میں ، ذرا سی دور خوابوں سے
منقش جھلملاتی یاد کی پگھلی ہوئی چاندی
کا اک آئینہ بہتا ہے

وہیں تو گھر ہمارا ہے ، وہیں تو عشق رہتا ہے
وہیں تو عشق رہتا ہے

(۲۰۰۱)

ہاتھوں میں لئے سنگ کی سوغات چلی ہے
اُترے گی مرے گھر ہی جو بارات چلی ہے

ملتے ہیں گھڑی بھر کو دکھانے کیلئے زخم
یاروں میں نئی طرزِ ملاقات چلی ہے

لگتا ہے کہ افسانۂ رسوائی بنے گی
وہ بات جو اغیار سے بے بات چلی ہے

جو عشق نے چاہا ہے وہی کر کے دکھایا
کب دل کے حضور اپنی کوئی بات چلی ہے

پھر کوئے سیاست میں بعنوانِ شریعت
اک رسمِ خریداریِ جذبات چلی ہے

(۲۰۰۲)

اپنی قربت کے سب آثار بھی لیتے جانا
اب جو جاؤ در و دیوار بھی لیتے جانا

چھوڑ کر جا ہی رہے ہو تو پھر اپنے ہمراہ
ساتھ رہنے کا وہ اقرار بھی لیتے جانا

دکھ تو ہوگا مگر احساس ہو کم کم شاید
جاتے جاتے مرا پندار بھی لیتے جانا

بیخودی مجھ سے مری چھین کے جانے والے
آگہی کے کڑے آزار بھی لیتے جانا

جشنِ آزادیِ اظہار میں اے نغمہ گرو!
میری زنجیر کی جھنکار بھی لیتے جانا

اُن سے ملنے کبھی جاؤ تو بطرزِ سوغات
مجھ سے مل کر مرے اشعار بھی لیتے جانا

بزمِ یاراں نہیں حاکم کی عدالت ہے ظہیرؔ
سر پر اُونچی کوئی دستار بھی لیتے جانا

(۲۰۰۲)

طعنۂ سود و زیاں مجھ کو نہ دینا ، دیکھو
میرے گھر آؤ کبھی ، میرا اثاثہ دیکھو

در کشادہ ہے تمہارا مجھے تسلیم مگر
مجھ میں جھانکو ، کبھی قد میری انا کا دیکھو

بس سمجھ لینا اُسے میری سوانح عمری
سادہ کاغذ پہ کبھی نام جو اپنا دیکھو

اِس خموشی کو مری ہار سمجھنے والو!
بات سمجھو ، مرے دشمن کا نشانہ دیکھو

آج لگتا ہے کہ پھر اُس سے ملے ہو جاکر
گفتگو تو سنو اپنی ، ذرا لہجہ دیکھو

کس کی یادوں سے ہے میرے سخن کو نسبت
ڈائری کھولو پرانی ، یہ حوالہ دیکھو

مانگنا خیر تم اُس حاصلِ ہجرت کی ظہیرؔ
اجنبی شہر میں جب کوئی شناسا دیکھو

(۲۰۰۲)

منظر وہی پرانا ہے ، موسم نیا نیا
بدلا جو میں نے زاویہ ، عالم نیا نیا

تازہ ہے دوستی ابھی لہجے نہ جانچئے
کھُلتا ہے تار تار یہ ریشم نیا نیا

دل کی خلش بڑھی ہے تری قربتوں سے اور
زخموں کو جیسے ملتا ہے مرہم نیا نیا

ہر عکس کرچیاں سی چبھاتا ہے آنکھ میں
پتھر اور آئنے کا ہے سنگم نیا نیا

یارب ہو میرے شہرِسیاست میں سب کی خیر
گلیوں میں پھر اٹھا کوئی پرچم نیا نیا

پیروں کو یوں بھی رقص کی عادت نہیں ظہیرؔ
چھیڑا ہے زندگی نے بھی سرگم نیا نیا

(۲۰۰۲)

یہ کہہ رہے ہیں وہ کالک اُچھالنے والے
ہمی ہیں شہر کی رونق اُجالنے وا لے

منافقت کی عفونت بھی ساتھ لائے ہیں
گلے میں ہار گلابوں کا ڈالنے والے

دہن میں لقمۂ شیریں بھی رکھتے جاتے ہیں
مرے وجود میں لاوا اُبالنے والے

ـ

ہجوم چنتا ہے ساحل پہ سیپیوں سے گہر
نظر سے گم ہیں سمندر کھنگالنے والے

کہاں گئے وہ شناور اندھیری جھیلوں کے
وہ ڈوبے چاند کو باہر نکالنے والے

نہیں ڈھلیں گے کبھی سیم و زر کے سانچوں میں
تمہاری یاد کو شعروں میں ڈھالنے والے

(۲۰۰۲)

ڈیڑاوُو
(جھیل مشی گن کے کنارے)

جھیل کی سرد ہوا ہے یہ مرے چاروں طرف
یا کسی بھولی ہوئی یاد کا جھونکا ہے کوئی
مجھے چُھوتی ہوئی گذری ہے تو محسوس ہوا
جیسے اک یاد کے یخ بستہ دریچے پہ کہیں
عکسِ امروز نے موہوم سی دستک دی ہے
اسقدر ماند ہے اس موجۂ احساس کی رو
سرمئی دھند میں لپٹا ہوا دن ہو جیسے
یادِ ماضی کا یہ بھولا ہوا لمحہ بھی کبھی
وقت کی رو میں گلابوں کی طرح تازہ تھا
اپنے ماحول کے سب رنگوں کی ساری حدت
اپنے دامن میں لئے پوری طرح زندہ تھا
جیسے ہوتا ہے مگر ویسے ہی رفتہ رفتہ
فکرِ فردا کے زمستانوں کی ژالہ باری
تہ بہ تہ دل کی زمیں پرہوئی ایسے شب و روز
منجمد ہو گئے سوئی ہوئی یادوں کے نقوش
آج اس جھیل مشی گن کے کنارے سے اِدھر

ہلکی برسات میں بھیگے ہوئے گیلے پتے
اپنی رعنائی کی خوشبو سے مہک کر خود ہی
تال پر بوندوں کی بجنے لگے دھیرے دھیرے
دُور اک موجۂ بے تاب نے اٹھ کر جیسے
ساتھ اُڑتے ہوئے سِیگل کا چمکتا سا بدن
ذرا دھیرے سے چُھوا اور یونہی چھوڑ دیا
جانے کیا وعدۂ و پیماں ہوئے اُس لمحے میں
پاس اک شرمگیں چہرے پہ دھنک پھیل گئی
گل ستاں جیسے سمٹ جائے کسی غنچے میں
رقص کرتی ہوئی کچھ شوخ سی بیباک ہوا
اک کھلی زلف سے اُلجھی تو یہ سوچا میں نے
جھیل کی سرد ہوا ہے یہ مرے چاروں طرف
یا کسی بھولی ہوئی یاد کا جھونکا ہے کوئی
یہ سمے مجھ پہ کہیں پہلے بھی ہو گذرا ہے
یا کہیں میرے تصور کا یہ دھوکا ہے کوئی

ڈور کاؤنٹی (وسکانسن)۔ ۲۰۰۲

وطنِ عزیز میں حکومت کی تبدیلی پر

***

ایک چہرہ بدل گیا ہو گا
ایک پرچم اتر گیا ہو گا
ایک دنیا سَنور چلی ہو گی
ایک عالَم بکھر گیا ہو گا
نشر گاہوں سے پھر فضاؤں میں
وعدۂ خوب تر گیا ہو گا
پھر خوشامد کا حرفِ بے توقیر
سرخیوں میں اُبھر گیا ہو گا
کچھ سیاسی بیان بازوں کا
آج قبلہ سدھر گیا ہو گا
رُخ بدلتے وفا فروشوں سے
شہر بازار بھر گیا ہو گا
سرِ منبر خراج دینے کو
واعظِ نامور گیا ہو گا
مہرِ تائید لے کے بیعت میں
مفتیِ معتبر گیا ہو گا

اک کلاہِ ہزار منصب و جاہ
کج اداؤں کے گھر گیا ہوگا

ایک الزامِ سرکشی پھر سے
اہلِ غیرت کے سر گیا ہوگا

حاکمِ شہر کا طلب نامہ
ہر مخالف کے گھر گیا ہوگا

زرِ تاوان لینے ہرکارہ
کوبکو دربدر گیا ہوگا

سرپھروں کو دروغۂ زنداں
پا بہ زنجیر کر گیا ہوگا

جرم اپنے بھی صاحبِ میزان
بے گناہوں پہ دھر گیا ہوگا

ایک دنیا سنور چلی ہوگی
ایک عالم بکھر گیا ہوگا
ایک چہرہ بدل گیا ہوگا
ایک پرچم اتر گیا ہوگا

(۲۰۰۲)

ورثۂ درد ہے تنہائی چھپالی جائے
اپنے حصے کی یہ جاگیر سنبھالی جائے

کون دیکھے گا تبسم کی نمائش سے پرے
ٹوٹی دیوار پہ تصویر لگالی جائے

چہرے پڑھنا بھی اُسے آہی گیا ہو شاید
غم زدہ چہرے پہ مسکان سجالی جائے

اختلافات نہ بن جائیں تماشہ اے دوست
بیچ میں اب کوئی دیوار اٹھالی جائے

اپنی رفتار سے اب آؤ گزاریں دن رات
وقت کے ہاتھ سے زنجیر چھڑالی جائے

آنکھ بھر آئے کسی کی ، نہ دُکھے دل کوئی
ایسی تقریبِ ملاقات نکالی جائے

نہ ہی ادراکِ انا جس کو ، نہ پاسِ اقدار
اُس مسیحا سے بھلا کیسے دوا لی جائے

کیا سنائیں تمہیں ہم شہرِ یقیں کے حالات
لوگ کہتے ہیں کہ امید اٹھالی جائے

ورنہ شمشیر بچے گی نہ بچیں گے بازو
وار کرنا ہے تو پھر وار نہ خالی جائے

جان کیا چیز ہے بن آئے جب عزّت پہ ظہیرؔ
سر بچے یا گرے ، دستار بچالی جائے

(۲۰۰۲)

سفر حضر کی علامتیں ہیں ، یا استعارہ ہے قافلوں کا
یہ شاعری تو نہیں ہماری ، یہ روزنامہ ہے ہجرتوں کا

یہ رُوپ سورج کی دھوپ جیسا ، یہ رنگ پھولوں کی آنچ والا
یہ سارے منظر ہیں بس اضافی ، یہ سب تماشہ ہے زاویوں کا

ہر ایک اپنی انا کو تانے دُکھوں کی بارش میں چل رہا ہے
دیارِ ہجرت کے راستوں پر عجیب موسم ہے چھتریوں کا

ہر اک شباہت میں اپنا چہرہ دکھائی دیتا ہے عکس در عکس
خود آشنائی کی حد سے آگے عجب علاقہ ہے آئنوں کا

بس اب ضرورت کی وادیوں میں قیام جیسی مسافرت ہے
چلے تھے ہم جب ظہیرؔ گھر سے تو اک ارادہ تھا پربتوں کا

(۲۰۰۲)

عشق

پیکرِ خاک میں تاثیرِ شرر دیتا ہے
آتشِ درد میں جلنے کا ثمر دیتا ہے

اک ذرا گردشِ ایّام میں کرتا ہے اسیر
دسترس میں نئے پھر شام و سحر دیتا ہے

پہلے رکھتا ہے یہ آنکھوں میں شبِ تیرہ وتار
دستِ امکان میں پھر شمس و قمر دیتا ہے

دل پہ کرتا ہے یہ تصویر جمالِ ہستی
پھر مٹاکر اُسے اک رنگِ دگر دیتا ہے

جذبِ صادق ہو تو کرتا ہے مقدر منزل
کارِ بے نام کو عنوانِ ظفر دیتا ہے

دور جائیں تو بلاتا ہے یہ اپنی جانب
لوٹ کر آئیں تو پھر اذنِ سفر دیتا ہے

اُس میں قیدِ درودیوار نہیں رکھتا عشق
اپنے آشفتہ مزاجوں کو جو گھر دیتا ہے

یہ کرشمہ ہے عجب عشقِ تضاد آور کا
پھول سے جسم کو پتھر کا جگر دیتا ہے

لمس پارس تو نہیں بنتا ،مگر یہ سچ ہے
ڈھونڈنے والوں کو مٹی میں گہر دیتا ہے

تابِ گویائی چرا لیتا ہے ان ہونٹوں کی
عشقِ پرکار جب آنکھوں کو نظر دیتا ہے

قلبِ فنکار کو دیتا ہے یہ روحِ احساس
پھر اسے جراءتِ اظہارِ ہنر دیتا ہے

آؤ چلتے ہیں ذرا بزمِ سخن میں اسکی
لوگ کہتے ہیں وہ لفظوں کو اثر دیتا ہے

(۲۰۰۳)

سنگ آئے یا کوئی پھول ، اٹھا کر رکھئے
جو ملے نام پر اُس کے وہ سجا کر رکھئے

سجدۂ عجز سے بڑھ کر نہیں معراج کوئی
سربلندی ہے یہی سر کو جھکا کر رکھئے

دل پہ اُترا ہوا اک حرفِ محبت نہ مٹے
اسمِ اعظم ہے یہ تعویذ بنا کر رکھئے

گر کے خاشاک ہوا جس میں انا کا شیشم
ہے وہی خاکِ شفا اُس کو اٹھا کر رکھئے

ہم یوں کھلتے نہیں دوچار ملاقاتوں میں
ایک دو روز ہمیں پاس بلا کر رکھئے

(۲۰۰۳)

اُن لبوں تک اگر گیا ہوگا
شعر میرا نکھر گیا ہوگا

ترکِ الفت نہیں تھی خو اُس کی
میری حالت سے ڈر گیا ہوگا

اعتباراُس کے دل سے دنیا کا
جانے کس بات پر گیا ہوگا؟

زہر پینے سے کون مرتا ہے
کوئی غم کام کرگیا ہوگا

پاؤں اٹھتے نہیں دوانے کے
کوئی زنجیر کر گیا ہوگا

برگ جھڑتے ہیں آنسوؤں کی طرح
موسمِ گل گزر گیا ہوگا

کتنا نکلا ہے سخت جاں یہ ضمیر
ہم تو سمجھے تھے مر گیا ہوگا

ناؤ ڈوبے مری زمانہ ہوا
اب تو دریا اُتر گیا ہوگا

تذکرہ میرا اُس کی محفل میں
سب کو خاموش کرگیا ہوگا

بازی ہارا ہے کب عدو سے ظہیرؔ
کچھ سمجھ کر ہی ہَر گیا ہوگا

(۲۰۰۲)

منزل کو جانتا تھا ، اشارہ شناس تھا
ٹھہرا نہ وہ کہیں جو نظارا شناس تھا

انجام لکھ گیا مرا آغازِ عشق سے
اک شخص کس بلا کا ستارہ شناس تھا

ساگر کی سرکشی سے میں لڑتا تھا جن دنوں
واقف ہوا سے تھا نہ کنارہ شناس تھا

ہوتا نہ بے وفا تو گزرتی بہت ہی خوب
میں خوگرِ زیاں ، وہ خسارہ شناس تھا

آزارِ مصلحت میں کہیں کھو گیا اے دوست
جو شخص مجھ میں تیرا اشارہ شناس تھا

(۲۰۰۳)

وہ بھی اب مجھ کو بہ اندازِ زمانہ مانگے
برسرِ عام محبت کا تماشا مانگے

جسے پندار مرے ظرفِ محبت نے دیا
اب وہ پہچان محبت کے علاوہ مانگے

میں تو اسرافِ محبت میں ہوا ہوں مقروض
دوستی ہر گھڑی پہلے سے زیادہ مانگے

راحتِ وصل بضد ہے کہ بھلادوں ہجراں
چند لمحے مجھے دے کر وہ زمانہ مانگے

مدّتیں گذریں کئے ترکِ سکونت لیکن
آج بھی دنیا اُسی گھر کا حوالہ مانگے

میں جہاں کھویا تھا شاید کہ وہیں مل جاؤں
کوئی مجھ کو غمِ دنیا سے دوبارہ مانگے

بٹ چکی درد کی جاگیر مگر تیرا غم
دل میں ہر روز نیا ایک علاقہ مانگے

(۲۰۰۳)

آنکھوں سے فکرِ ذات کے منظر چلے گئے
اشکوں کے بے کنار سمندر چلے گئے

محور سے جب ہٹا گئی مرکز گریزیت
ذرے سے آفتاب کے جوہر چلے گئے

دھیمی ہوئی ہے عشق فسوں گر کی جب سے آنچ
حسنِ ستم طراز کے تیور چلے گئے

دیکھی جو خوش عقیدگی اہلِ زمین کی
کچھ لوگ آسماں کے برابر چلے گئے

-ق-

بے خال وخد سے رہ گئے کردارِ بے نقوش
رعنائیِ خیال کے پیکر چلے گئے

شایانِ زیب و زینتِ گلشن نہیں کوئی
ہم قامتِ چنار و صنوبر چلے گئے

رندانِ خوش ادا رہے مقتل میں سر بکف
جتنے تھے کج نوا سرِ منبر چلے گئے

ـ

بیٹھے رہو اب اپنی انا کو سنبھال کر
جن کا تھا انتظار وہ آکر چلے گئے

باقی ہیں اس خرابۂ ہجرت میں ہم ظہیرؔ
واپس ہمارے ساتھ کے اکثر چلے گئے

(۲۰۰۳)

گرمیٔ شہرِ ضرورت سے پگھل جاؤ گے
نہیں بدلے ہو ابھی تک تو بدل جاؤ گے

اس چمکتے ہوئے دن کو نہ سمجھنا محفوظ
اپنے سائے سے بھی نکلو گے تو جل جاؤ گے

گردشِ وقت ہے آتی ہے سبھی کے سر پر
وقت گزرے گا تو اس سے بھی نکل جاؤ گے

یہ محبت کے مقامات ہیں اے جانِ نظر
اتنا محتاط چلو گے تو پھسل جاؤ گے

اپنی تابش کو زمینوں سے نہ کرنا مشروط
ورنہ سورج کی طرح شام کو ڈھل جاؤ گے

گر رہا ہوں میں مسلسل ہی ،مگر جانے کیوں
کوئی اندر سے یہ کہتا ہے سنبھل جاؤ گے

تھام کر ہاتھ چلو تم بھی ظہیرؔ اپنوں کا
ورنہ اِس بھیڑ میں غیروں سے بدل جاؤ گے

(۲۰۰۳)

کب تلک بھیڑ میں اوروں کے سہارے چلیئے
لوگ رستے میں ہوں اتنے تو کنارے چلیئے

اب تو مجبور یا مختار گزارے چلیئے
قرض جتنے ہیں محبت کے اتارے چلیئے

جس نے بخشی ہے مسافت وہی منزل دیگا
ہوکے راضی برضا اُس کے اشارے چلیئے

اُن کے لائق نہیں کچھ اشکِ محبت کے سوا
بھر کے دامن میں یہی چاند ستارے چلیئے

معتبر ہوتی نہیں راہ میں گزری ہوئی رات
آ گئی شامِ سفر اپنے دُوارے چلیئے

ہم بھی قائل نہیں رستے کو پلٹ کر دیکھیں
ماضی ڈستا ہے تو پھر ساتھ ہمارے چلیئے

دشتِ ہجراں بھی گزر جائے گا عزّت سے ظہیرؔ
نامِ نامی اُسی رہبر کا پکارے چلیئے

(۲۰۰۳)

مجھ کو حصارِ حلقۂ احباب چھوڑ کر
صحرا ملا ہے گلشنِ شاداب چھوڑ کر

ملتی نہیں کہیں بھی سوائے خیال کے
اٹھے ہیں ایسی صحبتِ نایاب چھوڑ کر

سب کچھ بہا کے لے گئی اک موجِ اشتعال
دریا اتر گیا ہمیں غرقاب چھوڑ کر

اوجِ فلک سے گر گیا تحت الثریٰ میں عشق
طوفِ حریمِ ناز کے آداب چھوڑ کر

مسجد کی پاسبانی پر اب آگئی ہے بات
اٹھنا پڑے گا منبر و محراب چھوڑ کر

ہر چشم زیرِ خواب ہے یا زیرِ بارِ اشک
دیکھوں کسے میں دیدۂ مہتاب چھوڑ کر

نکلے رہو گے دوزخِ لیل و نہار میں
کب تک ظہیرؔ جنتِ بیتاب چھوڑ کر

(۲۰۰۳)

سر پہ رکھے گا مرے دستِ اماں کتنی دیر
بادِ بے درد میں تنکوں کا مکاں کتنی دیر

پوچھتی ہیں مری اقدار مرے بچوں سے
ساتھ رکھو گے ہمیں اور میاں کتنی دیر

بجھ گئی آگ تمناؤں کی جلتے جلتے
کچھ دھواں باقی ہے لیکن یہ دھواں کتنی دیر

رزق برحق ہے مگر یہ کسے معلوم کہ اب
رزق لکھا ہے مقدر میں کہاں کتنی دیر

جا چکے پتے ، ہوائیں بھی چلی جائیں گی
بے سبب ٹھہرے گی پیڑوں پہ خزاں کتنی دیر

ریگ زاروں میں کسے ڈھونڈنے نکلے ہو ظہیرؔ
ریت پر رہتے ہیں قدموں کے نشاں کتنی دیر

(۲۰۰۳)

زندگی کے رنگوں سے بام و در سجانے میں
ایک عمر لگتی ہے گھر کو گھر بنانے میں

بام و در کو حیثیت آدمی سے ملتی ہے
خالی گھر نہیں ہوتے معتبر زمانے میں

نفرتوں کے بدلے میں ہم کسی کو کیا دیں گے
خرچ ہوگئے ہم تو چاہتیں کمانے میں

پھول کھل اٹھے دل میں ، شبنمی ہوئیں آنکھیں
ذکر آگیا کس کا ہجر کے فسانے میں

شخصیت پرستی کے پیڑ پی گئے سب کچھ
ہوگئی زمیں بنجر کچھ درخت اگانے میں

(۲۰۰۳)

جلا ہے دل تو گمان و یقیں بھی جلنے لگے
مکاں جلا تو جلا سب مکیں بھی جلنے لگے

ہوائے شہر ضرورت کی بے نیازی سے
گھروں کی آگ میں ہم رہ نشیں بھی جلنے لگے

غرورِ عشق سلامت رکھے خدا میرا
تری وفا سے مرے نکتہ چیں بھی جلنے لگے

تمہاری بزم درخشاں رہے ہمارا کیا
چراغِ راہ گزر ہیں کہیں بھی جلنے لگے

یہ کیسی آگ اٹھی بے اماں زمینوں سے
دیارِ فقر کے گوشہ نشیں بھی جلنے لگے

(۲۰۰۳)

آنکھوں میں اب یقین کی جنت نہیں رہی
لہجے میں اعتماد کی شدت نہیں رہی

آشوبِ دہر ایسا کہ دنیا تو برطرف
خود پر بھی اعتبار کی ہمت نہیں رہی

۔ق۔

کس کس گلی نہ لے گئی آشفتگی ہمیں
کس کس نگر میں درد کی شہرت نہیں رہی

ویران اب بھی رہتا ہے عالم خیال کا
تنہائیوں میں پہلی سی وحشت نہیں رہی

ہر شام اب بھی اٹھتی ہے سینے میں ہُوک سی
بیکار گھومنے کی وہ عادت نہیں رہی

ہر شام اب بھی جمتی ہیں لوگوں کی بیٹھکیں
یارانِ خوش خیال کی صحبت نہیں رہی

آنے لگے ہیں راس ہمیں ہجر کے عذاب
نظروں میں اب وصال کی جنت نہیں رہی

ـ

ہم ہوگئے ہیں خود کسی آنگن کا سایہ اب
سائے میں بیٹھنے کی وہ فرصت نہیں رہی

رونق گلی کی لے گیا آسیبِ روزگار
وہ مطمئن مزاج سی خلقت نہیں رہی

ڈرتے تھے کس طرح سے کریں گے وضاحتیں
وہ مل کے رودیئے تو یہ دِقت نہیں رہی

کس کس کا دل ٹٹول کے دیکھیں ظہیرؔ اب
خود کو تلاش کرنے کی مہلت نہیں رہی

(۲۰۰۳)

وہ بھی بدل کے رنگ فضاؤں میں ڈھل گیا
مٹی کا آدمی تھا ، ہواؤں میں ڈھل گیا

لفظوں سے تھا بنا ہوا شاید وہ شخص بھی
اک غم ملا تو کیسی صداؤں میں ڈھل گیا

سینے میں جب جلالیا شعلہ چراغ نے
مٹی کا ٹھیکرا تھا ، شعاعوں میں ڈھل گیا

مجھ کو تو یاد اُس کے خدوخال بھی نہیں
دیکھا مجھے تو حسن اداؤں میں ڈھل گیا

بکھرا تو بن گیا وہ دھنک آسمان پر
سمٹا تو پھول جیسی قباؤں میں ڈھل گیا

ہم جانتے ہیں ایسا تو بالکل نہ تھا ظہیرؔ
جب سے ملا ہے تم سے وفاؤں میں ڈھل گیا

(۲۰۰۳)

مٹی سے پیار کر تو نکھر آئے گی زمین
دامن میں بھر کے اپنے ثمر آئے گی زمین

نیچے اتر خلاؤں سے لوگوں کے دکھ سمیٹ
شمس و قمر سے بڑھ کے نظر آئے گی زمین

کشتی کے آسرے کو ڈبو کر تو دیکھ تُو
پانی کے درمیان اُبھر آئے گی زمین

بٹ جائیں گی محبتیں لوگوں کیساتھ ساتھ
روٹی کے مسئلے میں اگر آئے گی زمین

طوفان بُن رہے ہیں جدھر بجلیوں کے جال
کہتا ہے ناخدا کہ اُدھر آئے گی زمین

رشکِ قمر بنے گی یہ اک روز دیکھنا
جب اپنی گردشوں سے گذر آئے گی زمین

(۲۰۰۳)

گوشوارہ

کیا حال سنائیں دنیا کا ، کیا بات بتائیں لوگوں کی
دنیا کے ہزاروں موسم ہیں، لاکھوں ہی ادائیں لوگوں کی
کچھ لوگ کہانی ہوتے ہیں ، دنیا کو سنانے کے قابل
کچھ لوگ نشانی ہوتے ہیں ، بس دل میں چھپانے کے قابل
کچھ لوگ گزرتے لمحے ہیں ، اک بار گئے تو آتے نہیں
ہم لاکھ بلانا بھی چاہیں ، پرچھائیں بھی اُن کی پاتے نہیں
کچھ لوگ خیالوں کے اندر جذبوں کی روانی ہوتے ہیں
کچھ لوگ کٹھن لمحوں کی طرح پلکوں پہ گرانی ہوتے ہیں
کچھ لوگ سمندر گہرے ہیں ، کچھ لوگ کنارہ ہوتے ہیں
کچھ ڈوبنے والی جانوں کو تنکے کا سہارا ہوتے ہیں
کچھ لوگ چٹانوں کا سینہ ، کچھ ریت گھروندا چھوٹا سا
کچھ لوگ مثالِ ابرِرواں ، کچھ اونچے درختوں کا سایا
کچھ لوگ چراغوں کی صورت راہوں میں اجالا کرتے ہیں
کچھ لوگ اندھیرے کی کالک چہروں پہ اُچھالا کرتے ہیں

کچھ لوگ سفر میں ملتے ہیں ، دو گام چلے اور رستے الگ
کچھ لوگ نبھاتے ہیں ایسا ، ہوتے ہی نہیں دھڑکن سے الگ
کیا حال سنائیں اپنا تمھیں ، کیا بات بتائیں جیون کی؟
اک آنکھ ہماری ہنستی ہے ، اک آنکھ میں رُت ہے ساون کی
ہم کس کی کہانی کا حصہ ، ہم کس کی دعا میں شامل ہیں؟
ہے کون جو رستہ تکتا ہے ہم کس کی وفا کا حاصل ہیں؟
کس کس کا پکڑ کر دامن ہم اپنی ہی نشانی کو پوچھیں؟
ہم کھوئے گئے کن راہوں میں، اس بات کو صاحب جانے دیں
کچھ درد سنبھالے سینے میں ، کچھ خواب لٹائے ہیں ہم نے
اک عمر گنوائی ہے اپنی ، کچھ لوگ کمائے ہیں ہم نے
دل خرچ کیا ہے لوگوں پر ، جاں کھوئی ہے ، غم پا یا ہے
اپنا تو یہی ہے سود و زیاں ، اپنا تو یہی سرمایا ہے
اپنا تو یہی سرمایا ہے

(۲۰۰۳)

جانے کتنے راز چھپے ہیں ٹھہرے ٹھہرے پانی میں
کون اُتر کر دیکھے اب اس یاد کے گہرے پانی میں

جل پریوں کی خاموشی تو منظر کا ا یک دھوکا ہے
فریادوں کا شور مچا ہے اندھے بہرے پانی میں

کوئی سیپ اُگلتی ہے موتی اور نہ موجیں کوئی راز
حرص و ہوا کے ایسے لگے ہیں چار سُو پہرے پانی میں

جھیل کے نیلے آئینے پر پتھر پھینکنے والو تم!
ساحل پر اب بیٹھ کے دیکھو بگڑے چہرے پانی میں

چاہا ہم نے جھیل کنارے چاندنی راتوں میں جن کو
کھلتے ہیں بن بن کے کنول وہ پھول سے چہرے پانی میں

(۲۰۰۳)

پھر کسی آئنہ چہرے سے شناسائی ہے
عاشق اپنے تماشے کی تمنائی ہے

مہربانی بھی مجھے اب تو ستم لگتی ہے
اک بغاوت سی رَگ و پے میں اُتر آئی ہے

سنگِ برباد سے اٹھتا ہے عمارت کا خمیر
خاکِ تخریب میں پوشیدہ توانائی ہے

عصرِ حاضر کے مسائل ہوئے بالائے حدود
اب نہ آفاقی رہا کچھ ، نہ علاقائی ہے

مسئلے دھرتی کے ہمزادِ بنی آدم ہیں
زندگی ساتھ میں اسبابِ سفر لائی ہے

شاعری صورتِ اظہارِ غمِ ذات نہیں
اپنی دنیا پہ مری تبصرہ آرائی ہے

(۲۰۰۳)

قطعہ

چپ چاپ جی رہے ہیں ، تماشہ نہیں بنے
اخبار کی خبر کا تراشہ نہیں بنے
کمزوری مت سمجھنا ہماری مٹھاس کو
مصری صفت ہوئے ہیں ، بتاشہ نہیں بنے

(۲۰۰۳)

تارہ تارہ بکھر رہی ہے رات
دھیرے دھیرے سے مر رہی ہے رات

ہاتھ میں کاسۂ فراق لئے
سر جھکائے گزر رہی ہے رات

کتنی تنہا فضا ہے گلیوں کی
سرد آہیں سی بھر رہی ہے رات

میری آوارگی کے پہلو میں
کوبکو در بدر رہی ہے رات

اک دریچے سے راہ تکتی ہے
سہمی سہمی ہے ، ڈر رہی ہے رات

آئنہ رو ہے منتظر کب سے
بال کھولے سنور رہی ہے رات

نیم روشن سی خوابگاہوں میں
بے لبادہ بکھر رہی ہے رات

برگِ عارض پہ صورتِ شبنم
قطرہ قطرہ اُتر رہی ہے رات

پھر تجھے بھولنے کی کوشش میں
جانے کیا یاد کر رہی ہے رات

(اکتوبر۲۰۰۳)

مکان اور مکین

سہما ہوا ہے کمرے میں برسوں کا انتظار
جالے ہیں فرقتوں کے کواڑوں کے بیچ میں
اک شخص ٹوٹ کر ہوا کچھ اور پُر بہار
اُگتے ہوں جیسے پھول دراڑوں کے بیچ میں

(۲۰۰۳)

نہ ملے تم ، تو ملا کوئی تمہارے جیسا
فائدہ عشق میں دیکھا ہے خسارے جیسا

موج اڑاتی ہوئی مخمور سمندر آنکھیں
ڈھونڈتی رہ گئیں اک شخص کنارے جیسا

عشق حیراں ہے ابھی پہلی نظر کے مانند
حسن ابھی تک ہے وہ خاموش نظارے جیسا

اک دھنک میرے تصور کو بنا رکھتا ہے
اُن لبوں پر جو تبسم ہے اشارے جیسا

وہ کہیں میرا تشخص نہ کچل کر رکھدے
مہرباں ہاتھ جو لگتا ہے سہارے جیسا

دیکھئے کیسے گزرتی ہے شبِ تنہائی
سوزِ دل آج بھڑکتا ہے شرارے جیسا

(۲۰۰۳)

سجا کے شبنمی آنسو گلاب چہرے پر
کہانی لکھ گیا کوئی کتاب چہرے پر

نظر سے اٹھتا ہے برباد جنتوں کا دھواں
سلگ رہے ہیں ہزاروں عذاب چہرے پر

نگاہیں ساتھ نہیں دیتیں شوخیِ لب کا
جھلک رہی ہے حقیقت سراب چہرے پر

کہانیاں پسِ پردہ ہزار ہوتی ہیں
طمانیت کا اگر ہو نقاب چہرے پر

مرے مزاج کا رد عمل نہیں شکنیں
رقم ہے عمرِ رواں کا حساب چہرے پر

ہمیں تو آیا نہ لوگوں سے گفتگو کرنا
سوال دل میں رہے اور جواب چہرے پر

دلوں میں جھانکنا کردے نہ آپ کو بھی دکھی
نگاہیں رکھئے بس اپنی جناب چہرے پر

(۲۰۰۳)

رستوں کا خوف ہے نہ مجھے فاصلوں کا ڈر
اُس کو سفر کا شوق ، مجھے رہبروں کا ڈر

جب سر پہ دھوپ تھی تو رہی بادلوں کی آس
اب سر پہ چھت ہوئی تو مجھے بارشوں کا ڈر

اک شخص جاتے جاتے بہت خامشی کے ساتھ
کانوں پہ رکھ گیا ہے دبی آہٹوں کا ڈر

محتاط چل رہا ہوں کہ چاروں طرف مرے
شیشہ مزاج لوگ ہیں اور کرچیوں کا ڈر

دیکھے ہیں میری آنکھ نے سورج کے جب سے داغ
دل سے نکل گیا ہے مرے آئنوں کا ڈر

(٢٠٠٣)

لوگوں نے ایک واقعہ گھر گھر بنا دیا
اُس کی ذرا سی بات کا دفتر بنا دیا

پہرے قیامتوں کے لگا کر زبان پر
دل کو ترے خیال نے محشر بنا دیا

صادق تھے ہم بھی جذبۂ منزل میں اس قدر
رستے کا ہر سراب سمندر بنا دیا

لے لے کے نقشِ بندگی دہلیز سے تری
ہم نے جبینِ عشق کا زیور بنا دیا

شہرِ وصال دیکھنا چاہا پلٹ کے جب
مجھ کو طلسمِ ہجر نے پتھر بنا دیا

بخشی کسی کو گہری خموشی مگر مجھے
اک عشقِ رائگاں نے سخنور بنادیا

رکھتے تھے ہم بھی پہلو میں ہیرا سا دل کبھی
آلامِ روزگار نے کنکر بنا دیا

(۲۰۰۳)

زہر کی ہے یہ لہو میں کہ دوا کی تیزی
دل کی رفتار میں آئی ہے بلا کی تیزی

اُس کے چھونے سے مرے زخم ہوئے رشکِ گلاب
بس گئی خون میں اُس رنگِ حنا کی تیزی

بھاؤ بڑھتے ہی گئے عشقِ طلب گار کے اور
راس آئی اُسے بازارِ وفا کی تیزی

پھر کسی رخصتِ تازہ کی خبر دیتی ہے
سرد موسم کے تناظر میں ہوا کی تیزی

صرف ہونٹوں سے جو نکلے تو صدا ہے رسمی
دل سے نکلے تو ہے برّاق دعا کی تیزی

شہر عادی ہے یہ سرگوشیاں سننے کا ظہیرؔ
کہیں بھونچال نہ بن جائے صدا کی تیزی

(۲۰۰۴)

خود فریبی کے نئے کچھ تو بہانے ڈھونڈیں
اُس کی الفت کے علاوہ بھی ٹھکانے ڈھونڈیں

گذری صدیوں کو گذارے چلے جائیں کب تک
چھوڑ کر ماضی چلو اور زمانے ڈھونڈیں

ہم کسی اور ہی اندازِ محبت کے ہیں لوگ
تازہ رشتوں میں بھی اقرار پرانے ڈھونڈیں

دل پہ مت لینا کہ لوگوں کی تو باتیں یوں ہیں
جیسے اُڑتے ہوئے کچھ تیر نشانے ڈھونڈیں

ڈار سے بچھڑے پرندوں کو نہیں معلوم اب
رزق ڈھونڈیں یا بسیرے کے ٹھکانے ڈھونڈیں

پھر کسی شام چلو یاد کے جنگل میں ظہیرؔ
ہم نے جو دفن کئے تھے وہ خزانے ڈھونڈیں

(۲۰۰۴)

رہبری کے زخموں کا چارہ گر نہیں ملتا
واپسی کے رستے میں ہمسفر نہیں ملتا

شہر ہے یا خواہش کی کرچیوں کا صحرا ہے
بے خراش تن والا اک بشر نہیں ملتا

ہر طرف ضرورت کی اک فصیلِ نادیدہ
بے شگاف ایسی ہے جس میں دَر نہیں ملتا

قہقہوں کے سائے میں بے بسی کا عالم ہے
مرگِ آدمیت کو نوحہ گر نہیں ملتا

انقلابِ دنیا نے زاویے بدل ڈالے
تذکروں میں ماضی کے اب مفر نہیں ملتا

جس کے در دریچے سب دل گلی میں کھلتے تھے
عہدِ نو کے قصوں میں وہ نگر نہیں ملتا

رات دن الجھتے ہیں بے نشان رستوں سے
خواہشوں کے جنگل میں سُکھ نگر نہیں ملتا

حرف معتبر ہوں تو اک روشنی سی دیتے ہیں
کاغذوں کو اب ورنہ آبِ زر نہیں ملتا

نم تو ہونا پڑتا ہے رنگ و روپ کی خاطر
خاکِ ریزہ ریزہ کو کوزہ گر نہیں ملتا

-ق-

وقت روٹھ جاتا ہے انتظارِ پیہم سے
گھر سے جانیوالوں کو پھر سے گھر نہیں ملتا

بام و در تو ملتے ہیں سب اسی جگہ قائم
چاہتوں کے آنگن میں اک شجر نہیں ملتا

گمشدہ سی گلیوں کے آشنا سے گوشوں میں
آہٹوں سے کھل جائے ایسا در نہیں ملتا

ساتھ لے گئے تھے تم عہدِ خوش نظر میرا
تم تو مل گئے آخر ، وہ مگر نہیں ملتا

(۲۰۰۴)

سنگِ ستم سے کوئی بھی شیشہ نہیں بچا
محفوظ وہ رہا جو دریچہ نہیں بچا

بازیگرانِ شہرِسیاست ہوئے خموش
اب دیکھنے کو کوئی تماشہ نہیں بچا

کیسی چڑھی ہے دھوپ سرِ شہر بد لحاظ
برگد ہرے بھرے ہوئے سایا نہیں بچا

پھیلاؤ کی ہوس بھرے دریا کو پی گئی
پانی چڑھا تو کوئی کنارہ نہیں بچا

بجھنے لگے چراغ مرے جسم و جان میں
دل میں لہو بقدرِ تمنا نہیں بچا

اک نقشِ لالہ رنگ تو رستے کو مل گیا
بیشک ہمارے پاؤں میں جوتا نہیں بچا

لگتا ہے یوں ، یا واقعی قحط الرجال ہے
لوگوں کے درمیان حوالہ نہیں بچا

اہلِ ہوس کی حاشیہ آرائی سے ظہیرؔ
تاریخ در کنار صحیفہ نہیں بچا

(۲۰۰۴)

بات جو دل میں نہیں لب سے ادا کیسے کروں
میں خفا تو ہوگیا اُس سے ، گلہ کیسے کروں

دل کے ٹوٹے آئنے میں عکس ہے اک خواب کا
قیدِ رنگ و روپ سے اُس کو رہا کیسے کروں

سوچتا ہوں اک ہجومِ صد بلا کے درمیاں
عافیت کے خواب کو میں واقعہ کیسے کروں

روز و شب کے گنبدِ بے دَر سے مشکل ہے فرار
دَر اگر مل جائے بھی تو حوصلہ کیسے کروں

راہ کوئی روح کے اندر کُھلے تو بات ہے
میں کسی کے نقشِ پا کو رہنما کیسے کروں

ہم نشیں میرے ابھی تک ہیں خیالِ فرد فرد
ہم نظر میں کر بھی لوں تو ہمنوا کیسے کروں

زندگی سے وہ گیا اور زندگی جاتی رہی
مختصر سے حرفِ غم کو مرثیہ کیسے کروں

ہر گھڑی دل پر مرے دستک نئی خواہش کی ہے
اسقدر جب شور ہو ، تجھ کو صدا کیسے کروں

شرم آتی ہے مجھےحاجت روا کے سامنے
خواہشوں کی فکر کو حرفِ دعا کیسے کروں

دور کچھ بھی تو نہیں وہ ، ہے مری مشکل یہی
دو قدم کا فاصلہ ہے ابتدا کیسے کروں

کس طرح اتنی محبت اب نبھاؤں میں ظہیرؔ
اتنا قرضِ دوستی آخر ادا کیسے کروں

(۲۰۰۴)

مرے شہر ذرّہ نواز کا وہی سر پھرا سا مزاج ہے
کبھی زیبِ سر ہے غبارِ رہ ، کبھی زیرِ پا کوئی تاج ہے

کہیں بے طلب سی نوازشیں ، کہیں بے حساب محاسبے
کبھی محسنوں پہ ملامتیں ، کبھی غاصبوں کو خراج ہے

وہی بے اصول مباحثے ، وہی بے جواز مناقشے
وہی حال زار ہے ہر طرف ، جو روش تھی کل وہی آج ہے

وہی اہلِ حکم کی سازشیں ، وہی نفرتوں کی سیاستیں
نہیں بدلا طرزِ منافقت ، وہی مصلحت کا رواج ہے

کبھی چہرہ پوش ندامتیں ، کبھی سینہ زور بغاوتیں
اک اترتے چڑھتے فشارِ دم کے اثر میں سارا سماج ہے

کوئی درد ہو کوئی زخم ہو ، وہی میٹھے زہر کی گولیاں
کوئی عارضہ ہو کہ سانحہ ، وہی عارضی سا علاج ہے

سرِشہرِ یاراں گئے تھے ہم کہ چُکا کرآئیں گے واجبات
پہ بڑھا کے آگئے قرضِ جاں جو محبتوں کا بیاج ہے

(پاکستان سے واپسی پر۔ ۲۰۰۴)

ملتی نہیں منزل تو مقدر کی عطا ہے
یہ راستہ لیکن کسی رہبر کی عطا ہے

کب میری صفائی کو بھلا مانے گی دنیا
الزام ہی جب ایسے فسوں گر کی عطا ہے

جچتے نہیں آنکھوں میں شبستان و گلستاں
یہ دربدری ایسے کسی در کی عطا ہے

ساحل کے خزانے نہیں دامن میں ہمارے
جو کچھ بھی ملا ، گہرے سمندر کی عطا ہے

اُجرت میں ملی ہے مجھے اقلیمِ سخن یہ
ہر شعر کسی زخمِ ستمگر کی عطا ہے

محشر میں بنے گی مری بخشش کا سبب یہ
نسبت جو مجھے ساقیِ کوثر کی عطا ہے

(۲۰۰۴)

بس بہت ہوگئے نیلام ، چلو لوٹ چلو
اتنے ارزاں نہ کرو دام ، چلو لوٹ چلو

نہ مداوا ہے کہیں جن کا ، نہ امیدِ قرار
ہر جگہ ہیں وہی آلام ، چلو لوٹ چلو

معتبر ہوتی نہیں راہ میں گزری ہوئی رات
اس سے پہلے کہ ڈھلے شام ، چلو لوٹ چلو

ماہِ نخشب سے یہ چہرے ہیں نظر کا دھوکا
چاند اصلی ہے سرِ بام ، چلو لوٹ چلو

پتے اُڑتے ہیں ہواؤں میں پرندوں کی جگہ
رُت بدلنے کا ہے پیغام ، چلو لوٹ چلو

اس سے پہلے کہ زمانہ کوئی دیدے عنوان
واقعہ ہے ابھی بے نام ، چلو لوٹ چلو

اک ہوس کہتی ہے "کچھ دور ذرا اور ابھی"
اک صدا آتی ہے ہر گام "چلو لوٹ چلو"

منتظر کوئی نہیں مانا وہاں ، پھر بھی ظہیرؔ
کچھ ادھورے ہیں ابھی کام ، چلو لوٹ چلو

(۲۰۰۴)

ہدیۂ اشک ملے ، درد کی سوغات ملے
کاسۂ عشق ہے خالی کوئی خیرات ملے

بھر دے کشکولِ سماعت کو ہمیشہ کیلئے
لبِ لعلیں سے ترے ایسی کوئی بات ملے

کھیل چلتا ہی رہے گرچہ لپٹ جائے بساط
مات ہونی ہے تو پھر ایسی کوئی مات ملے

خاک اُڑانے کو ملی وسعتِ آشوبِ جہاں
غم اٹھانے کو ترے شہر میں دن رات ملے

اور کیا چاہیئے دہلیزِ محبت سے تری
گلشنِ عمر ملا ، پھول سے لمحات ملے

شکریہ کرتی رہے گی یہ نظر جھک جھک کر
کبھی مجھ سے جو تری چشمِ عنایات ملے

ہمکلام آپ ہوئے بھی تو غزل کی صورت
ہمیں اظہار کے پردے میں حجابات ملے

ہم سمجھتے تھے اُن آنکھوں میں ہر اُلجھن کا جواب
پڑھنا آیا تو ہزاروں ہی سوالات ملے

نہ شکایت ، نہ محبت ، نہ تغافل کی نظر
بزمِ یاراں میں بھی روٹھے ہوئے جذبات ملے

خوف کچھ اپنی جسارت کا تھا ، کچھ اُن کا ادب
جب کبھی اُن سے ملے ہم بڑے محتاط ملے

کام سے آتے ہیں ملنے تو ہزاروں ہی ظہیرؔ
دل یہ کرتا ہے کوئی بہرِ ملاقات ملے

(۲۰۰۴)

(سانحہ گیارہ ستمبر کی تیسری برسی پر)

مری ہمنوائی میں جب تلک مرے یارِ عربدہ جُو نہ تھے
پسِ پردہ سب تھے حریفِ جاں ، کبھی روبرو تو عدو نہ تھے

گو خبر تھی اہلِ نظر کو سب ، پہ بھرم تھا پھر بھی جہان میں
تہی دامنی کے یہ تذکرے کبھی زیبِ قریہ و کُو نہ تھے

مرے دوستوں کے وہ مشورے ، صفِ دشمناں کے یہ فیصلے
تھے اگرچہ دونوں الگ الگ ، کبھی مختلف سرِ مو نہ تھے

یہ ستم طرازیِ وقت ہے کہ ہماری غفلتِ بے اماں
وہی پاسبانِ حرم ہیں اب جو شریکِ کلمۂ ہُو نہ تھے

اک ادائے نفرتِ بے محل مرا اعتبار گنوا گئی
مرے ہم پیالہ و ہم نشیں ، مرے تشنگانِ لہو نہ تھے

تھے ہمیشہ درپئے مال و زر ، پہ اثاثِ دل پہ نظر کریں؟
اربابِ ظلم کے حوصلے تو بلند اتنے کبھو نہ تھے

وہی ہاتھ جن کو جنون تھا تزئینِ حسنِ بہار کا
وہ قلم ہوئے اِسی جرم میں کہ اسیرِ رسمِ غلو نہ تھے

سبھی ہوگئے کہیں دربدر ، کہیں کھوگئے مرے خوش نظر
میں کہاں سے لاؤں وہ نقش گر جو بہارِ گل کا نمونہ تھے

یہ شہیدِ جلوۂ آگہی جنہیں تیرے درد نے چن لیا
وہی کشتگانِ خمار ہیں جو قتیلِ جام و سبو نہ تھے

جو نبردِ عشق میں کٹ گئے یا حضورِ ناز میں جھک گئے
وہی سربلند رہے سدا جو ظہیرؔ بارِ گلو نہ تھے

(گیارہ ستمبر ۲۰۰۴)

نصیب ہو جو کبھی اُس کی آرزو کرنا
متاعِ دیدہ و دل صرفِ جستجو کرنا

گمان تک بھی نہ گزرے کہ غیر شاہد ہے
یہ جس کا سجدہ ہے بس اُس کے روبرو کرنا

ملیں گے حرفِ عبادت کو نت نئے مفہوم
کبھی تم اُس سے اکیلے میں گفتگو کرنا

ہزار رہزنِ ایمان سے ملے گی نجات
کوئی سفر ہو عقیدت کا قبلہ رو کرنا

وہ ذاتِ پاکِ گرامی ہے ماورائے خیال
ظہیرؔ اُن کا تصور بھی با وضو کرنا

(۲۰۰۴)

کسی کو روک لیں ہم ، ایسے کم نگاہ نہیں
مسافرانِ محبت ہیں سنگِ راہ نہیں

-ق-

ستم تو یہ ہے کہ دنیا تمہارے زیرِ ستم
تمہارے ظلم کا پھر بھی کوئی گواہ نہیں

کھلا ہے کون سا رستہ سپاہِ جبر سے آج
بچا ہے کون سا قریہ جو رزم گاہ نہیں؟

متاعِ ہستی کہاں رکھئے اب بجز مقتل
کسی طرف بھی کوئی گوشۂ پناہ نہیں

حلیف بیچ گئے مجھ کو اپنی جاں کے عوض
مرے بچاؤ کی اب تو کوئی بھی راہ نہیں

-

کھلے ہیں چند شگوفے مثالِ دستِ دعا
یہ دشتِ بے ثمر اتنا بھی بے گیاہ نہیں

غبارِ کشتۂ مظلوم عرش چھُولے گا
نصیبِ فرش نہ ہوگا ، یہ گردِ راہ نہیں

اگر ظہیرؔ ہو شانے پر اپنے دستِ حبیب
عدو سے ہاتھ ملانا کوئی گناہ نہیں

(۲۰۰۴)

اِس کے ہر ذرّے سے پیمان دوبارہ کرلو
اپنی مٹی کو مقدر کا ستارہ کرلو

برف سی جمنے لگی دل پہ نئے موسم کی
ہجر کی آنچ کو بھڑکا کے شرارہ کرلو

صحن بھر چاندنی کب راہ نوردوں کا نصیب!
آنکھ میں عکسِ قمر بھر کے گزارہ کرلو

تلخیاں ہیں نئے منظر میں ہماری اپنی
خوش نظر بن کے یہ آئینہ گوارہ کرلو

ہجرتوں میں تو مرے یار یہی ہوتا ہے
خواب بیچو یا محبت میں خسارہ کرلو

اب تو دشمن بھی تمہارا ہی سمجھتے ہیں ہمیں
اعتبار اب تو محبت میں ہمارا کرلو

اس کے سائے میں امانت ہے کئی نسلوں کی
گرتی دیوار کو مضبوط خدارا کرلو

پار کروا کے مجھے اُس نے کہا دریا پار
ڈوبنے والا ہوں میں مجھ سے کنارہ کرلو

(۲۰۰۴)

(برگد جیسے لوگوں کے نام)

کوئی بھی رُت ہو چمن چھوڑ کر نہیں جاتے
چلے بھی جائیں پرندے ، شجر نہیں جاتے

ہوا اُتار بھی ڈالے اگر قبائے بدن
بلند رکھتے ہیں بازو بکھر نہیں جاتے

گئی رتوں کے سبھی رنگ پہنے رہتے ہیں
شجر پہ رہتے ہیں موسم گزر نہیں جاتے

خمیر بنتے ہیں مٹی کا ٹوٹ کر بھی شجر
جنم دوبارہ سے لیتے ہیں ، مر نہیں جاتے

جو برگ و بار سے عاری ہوں ، سائے سے خالی
وہ کٹ کے جلتے ہیں سو بے ثمر نہیں جاتے

شجر تو ان کے بھی ناموں کو زندہ رکھتے ہیں
وہ بدنصیب جو گھر لوٹ کر نہیں جاتے

(۲۰۰۴)

بے سبب ہم بھی تہِ دام نہ آئے ہونگے
فرش نے عرش کے امکان دکھائے ہوں گے

سر جھکاتے ہیں جو ہر سنگ پہ کہہ کر لبیک
خوئے تسلیم تری بزم سے لائے ہوں گے

جن کے سینے میں دھڑکتا ہو کسی اور کا دل
لوگ ایسے بھی تو قدرت نے بنائے ہونگے

اختلافاتِ نظر خود ہیں اُجالے کا ثبوت
جس جگہ روشنی ہوگی وہیں سائے ہوں گے

کیسے اک مشتِ عناصر میں دھڑکتی ہے حیات
راز کیا کیا گِلِ آدم میں سمائے ہوں گے

لائی ہے بادِ سحر راکھ ، دھواں اور شبنم
اُس نے پھر خط مجھے لکھ لکھ کے جلائے ہونگے

لوگ سن کر مرے اشعار اُسے جان گئے
کیا خبر تھی مرے لفظوں میں کنائے ہونگے

دشتِ تعبیر میں ملتی نہیں منزل جو ہمیں
چشمِ رہبر میں کہیں خواب پرائے ہونگے

دیئے میراث کے ٹوٹے ہوئے مت پھینک ظہیرؔ
کچھ اندھیرے بھی ترے حصے میں آئے ہونگے

(۲۰۰۵)

نہیں لیا کوئی احسانِ باغباں ہم نے
بھری بہار میں چھوڑا ہے گلستاں ہم نے

سفر میں رہ گئے پیچھے مگر یہ کم ہے کیا
ہر ایک موڑ پہ چھوڑے ہیں کچھ نشاں ہم نے

تمہارے نام کی افشاں سے جو سجائی تھی
کسی کی مانگ میں بھر دی وہ کہکشاں ہم نے

بچا کے لائے تھے بس اک چراغ آندھی سے
جلا کے رکھ دیا محفل کے درمیاں ہم نے

جلا ہے زہرِ خموشی میں ایک عمر خیال
بنا اصیل تو کھولی ہے پھر زباں ہم نے

ضرورتوں کے سفر میں غرورِ نسبتِ حرف
تجھے گنوایا ہے جانے کہاں کہاں ہم نے

مقیمِ راہِ سفر ہیں ، سروں پر اپنے ظہیرؔ
غبارِ راہ کو رکھا ہے سائباں ہم نے

(۲۰۰۵)

حبس جاں رونے سے کچھ اور گراں ہوتا ہے
آگ بجھتی ہے تو انجام دھواں ہوتا ہے

تابِ گفتار ہی باقی ہے نہ موضوعِ سخن
اب ملاقات کا ماحول زباں ہوتا ہے

کھینچ لائی ہے ضرورت مجھے کن راہوں میں
ہر قدم پر مجھے دھوکے کا گماں ہوتا ہے

غیر سے میری شکایت کا مجھے رنج نہیں
گلہ شکوہ بھی محبت کا نشاں ہوتا ہے

کارِ دنیا کا ہمالہ ہے مجھے ریت کا ڈھیر
دل نہ چاہے تو یہی کوہ گراں ہوتا ہے

ربطِ محکم بھی ضروری ہے صد اخلاص کیساتھ
معجزہ صرف دعاؤں سے کہاں ہوتا ہے

جس عمارت میں توازن نہ دکھائی دے ظہیرؔ
اُس کی بنیاد میں اک سنگِ زیاں ہوتا ہے

(۲۰۰۵)

مجھے نسبت جو کسی در سے نہ دربار سے ہے
یہ عنایت بھی ترے نام کی سرکار سے ہے

بادبانوں کا تکلف نہیں کشتی میں مری
آسرا مجھ کو ہوا سے نہیں پتوار سے ہے

گونج رہ جائے گی میری جو صدا مر بھی گئی
اتنی امید مجھے شہر کی دیوار سے ہے

شورِ زنجیر بپا رکھتی ہے جکڑی ہوئی امید
دل کی دھڑکن میں ترنم اسی جھنکار سے ہے

سرخیاں حسبِ خبر ہیں ، نہ خبر حسبِ حال
پڑھنے والوں کو گلہ آج کے اخبار سے ہے

عشق کی دین نہیں ، جبرِ ضرورت ہے یہ ہجر
خلعتِ درد خریدی ہوئی بازار سے ہے

(۲۰۰۵)

پھر لگا ہے دوستوں کا تازیانہ مختلف
تیر دشمن کی طرف ہیں اور نشانہ مختلف

بے نیازی برطرف ، اب لازمی ہے احتیاط
وقت پہلا سا نہیں اب ، ہے زمانہ مختلف

آشیانہ چھوڑنے کی اک سزا یہ بھی ملی
روز لاحق ہے تلاشِ آب و دانہ مختلف

اک شکم پرور زمیں رکھتی ہے پابستہ مجھے
اور وفائیں مانگتی ہیں اک ٹھکانہ مختلف

دوسرا رخ بھی وہی نکلا تری تصویر کا
کاش ہوتا کچھ حقیقت سے فسانہ مختلف

اپنے بچوں کو ظہیرؔ انسانیت کا درس دو
نفرتوں کے شہر میں رکھو گھرانہ مختلف

(۲۰۰۵)

لہروں پہ سفینہ جو مرا ڈول رہا ہے
شاید مری ہمت کو بھنور تول رہا ہے

شیریں ہے تری یاد مگر ہجر لہو میں
شوریدہ ہواؤں کا نمک گھول رہا ہے

پتوار بنا کر مجھے طوفانِ حوادث
قامت مری پرچم کی طرح کھول رہا ہے

ساحل کی صدا ہے کہ سمندر کا بلاوا
گہرائی میں سیپی کی کوئی بول رہا ہے

یہ وقت مجھے موتی بنائے گا کہ مٹی؟!
اک آبِ رواں ہے کہ مجھے رول رہا ہے

کھُلتے نہیں کردار کہ ہیرو یا ولن ہیں
اپنی تو کہانی میں یہی جھول رہا ہے

(۲۰۰۵)

خیالِ خاطرِ احباب ہمسفر رکھنا
سفر کہیں کا ہو آغاز پر نظر رکھنا

شعاعِ نورِ محبت کو رکھنا قبلہ نما
جہاں یہ دل کرے سجدہ وہیں پہ سر رکھنا

تمام روپ محبت کے خوبصورت ہیں
کوئی بھی رشتہ کسی سے ہو معتبر رکھنا

چراغ بن نہیں سکتے تو بن کے تم فانوس
کسی چراغ کو موسم سے بے خطر رکھنا

قلم کو رکھنا ہمیشہ حصارِ گیتی میں
تخیل اپنا مگر آسمان پر رکھنا

ظہیرؔ اداس سی رہتی ہے یہ گلی اپنی
کبھی کبھی سہی لیکن یہاں گزر رکھنا

(۲۰۰۵)

مرے روز و شب کی کتاب میں کبھی تازہ برگِ گلاب تھا
خطِ زرفشاں سے لکھا ہوا مری زندگی کا نصاب تھا

وہ مثالِ ابر تھا آسرا کڑے موسموں کے دیار میں
وہ تمازتوں کے سوال پر مری تشنگی کا جواب تھا

جو بغاوتوں کے جواز میں مری سرکشی کا سبب رہا
وہ امین تھا مرے خواب کا ، وہ مرا غرورِ شباب تھا

مرے کسب زارِ کمال میں مری جستجو کا ہدف بنا
وہ محبتوں کی معاش میں مری اُجرتوں کا حساب تھا

وہ رہا شریکِ سکوتِ شب مری حسرتوں میں بجھا ہوا
کبھی لب کشا میں ہوا اگر تو وہ میری روحِ خطاب تھا

وہ علامتوں کی بہار تھا مری شاعری کی زمین میں
وہ فلک تھا سر پہ خیال کا ، وہ سخن کا لبِ لباب تھا

(۲۰۰۵)

الفاظ کے پردے میں اگر تُو نہیں نکلے
پھر نوکِ قلم سے کوئی جادو نہیں نکلے

دُھلتا ہے مرے اشکوں سے ہر رات یہ پھر بھی
تکیے سے ترے قرب کی خوشبو نہیں نکلے

منصف تو بڑی بات اگر ڈھونڈ نے جاؤ
اِس شہر ستم گر میں ترازو نہیں نکلے

روئے جو کبھی نیشۂ حالات پہ ہم لوگ
اک زہر ٹپک آیا ہے آنسو نہیں نکلے

دشمن مرے بیٹھیں جو حلیفوں کے مقابل
اک فرق بھی دونوں میں سرِ مُو نہیں نکلے

بے آسرا بیٹھے رہے ہم بزمِ وطن میں
جب تک کہ رہا درد پہ قابو ، نہیں نکلے

لڑنے کیلئے نکلے ہیں ہم جنگ بقا کی
گھر چھوڑ کے اپنا کوئی بھکشو نہیں نکلے

اک عمر ہوئی چھوڑے ہوئے دشتِ غزالاں
پیروں سے پہ خوئے رمِ آہو نہیں نکلے

(۲۰۰۵)

ہر گام اُس طرف سے اشارہ سفر کا تھا
منزل سے دلفریب نظارہ سفر کا تھا

جب تک امیدِ منزلِ جاناں تھی ہمقدم
دل کو ہر اک فریب گوارا سفر کا تھا

رہبر نہیں نصیب میں شاید مرے لئے
جو ٹوٹ کر گرا ہے ، ستارہ سفر کا تھا

رُکنے پہ کر رہا تھا وہ اصرار تو بہت
مجبوریوں میں اُس کی اشارہ سفر کا تھا

آتی تھی اُس کے پاؤں سے زنجیر کی صدا
سامان گرچہ کاندھوں پہ سارا سفر کا تھا

نکلا تلاشِ ذات کا ساحل بھی نامراد
دریا کے اُس طرف بھی کنارہ سفر کا تھا

رستہ کٹا تو ساتھی یہ کہہ کر الگ ہوئے
منزل بخیر! ساتھ ہمارا سفر کا تھا

لوٹا تو پھر ملی مجھے تحفے میں اک کتاب
دیکھا تو ایک تازہ شمارہ سفر کا تھا

بستی میں ہم ٹھہر کے تو بے آسرا ہوئے
خانہ بدوش تھے تو سہارا سفر کا تھا

راہیں الگ ہوئیں تو یہ مجھ پر کھُلا ظہیرؔ
وہ ہمسفر نہیں تھا ، خسارہ سفر کا تھا

(۲۰۰۵)

کتنے چراغ جل اٹھے ، کتنے سراغ مل گئے
آنکھیں جنوں کی کیا کھلیں ، اپنے تو ہونٹ سل گئے

ایسے پلٹ گئی ہوا دل کی کتاب کے ورق
یادوں کے کچھ گلاب جو کھوئے ہوئے تھے مل گئے

اک چہرے کی شباہتیں نکھریں مری نظر کے ساتھ
شاخِ نظر جھکی جدھر کچھ عکس تازہ کھل گئے

اپنی تو خیر راہ میں تھیں کرچیاں ہی کرچیاں
پھولوں پہ چل رہے تھے جو اُن کے بھی پاؤں چھل گئے

دیکھا نہیں کہ مصلحت کے ہیں تقاضے کس طرف
دل سے بلایا جس نے جب ، ہم تو بہ جان ودل گئے

اُن کی نظر سے کیا گرے اک زلزلہ سا اٹھ گیا
پندار کے پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ہل گئے

(۲۰۰۵)

اپنی تو ہجرتوں کے مقدر عجیب ہیں
اپنے ہی شہر میں ہیں نہ غربت نصیب ہیں

اب اعتبار کس کا کریں الجھنوں کے بیچ
باتیں ہیں دوستانہ سی لہجے رقیب ہیں

چارہ گروں کے طرزِ جراحت کا شکریہ!
آزار اب مری رگِ جاں کے قریب ہیں

مٹی سے تیری دور ہیں لیکن ہیں تجھ سے ہم
ہم بھی تو اے وطن ترے شاعر ادیب ہیں

(۲۰۰۵)

(سانحہ گیارہ ستمبر کے بعد میڈیا کے رویے اور
کردار کے حوالے سے لکھی گئی ایک غزل)

ایک منظر پسِ منظر بھی دکھایا جائے
لوحِ سادہ کو پلٹ کر بھی دکھایا جائے

ناتواں ہاتھ میں مجبور سے پتھر کے خلاف
ظلم کا آہنی لشکر بھی دکھایا جائے

سرنگوں مجھ کو دکھاتے ہو بتقریبِ شکست
پھر مری پشت میں خنجر بھی دکھایا جائے

جس کے ساحل پہ ہوئے پیاس کے مارے باغی
منصفوں کو وہ سمندر بھی دکھایا جائے

وہ جو رکھے گئے مصروفِ تماشائے نشاط
ان کو محرومی کا منظر بھی دکھایا جائے

سوزنِ دستِ رفوگر کی نمائش دیکھی
اب اُس استین کا خنجر بھی دکھایا جائے

پسِ کردار جو چہرے تھے ڈرامے میں ظہیرؔ
اُن کو بہروپ ہٹا کر بھی دکھایا جائے

(۲۰۰۵)

اپنے سر تیرے تغافل کا بھی الزام لیا ہے
خود فریبی کا ستم دل پہ کئی بار کیا ہے

دل نے اس طرح مداوائے غمِ عشق کیا ہے
اک نیا زہر ترے ہاتھ سے ہر روز پیا ہے

غم ترا مجھ کو جلاتا نہیں کرتا ہے منوّر
ہاتھ پر آگ نہیں یہ تو ہتھیلی پہ دیا ہے

عشق سچّا ہو تو کرتا ہے ہر اک قید سے آزاد
رشتہ جھوٹا ہے کہ جس نے تجھے زنجیر کیا ہے

گفتگو تلخ تھی اے چارہ گرو! مان لیا یہ
لب مرے زخم نہیں تھے کہ جنہیں تم نے سیا ہے

زندگی تجھ کو شب و روز یوں سینے سے لگا کر
کوئی جی کر تو دکھائے میں نے جس طور جیا ہے

(۲۰۰۵)

نہ کوئی باد نما تھا نہ ستارہ اپنا
رہنما کوئی اگر تھا تو یہ رستہ اپنا

زندگی گزری تضادات سے لڑتے لڑتے
فیصلے سارے تھے اوروں کے ، طریقہ اپنا

بے سلیقہ تو نہیں ، بے سر و سامان سہی
دست و بازو کو بنائیں گے وسیلہ اپنا

مان کرمشورے اپنوں کے اٹھایا ہے قدم
دیکھئے اب کیا نکلتا ہے نتیجہ اپنا

ڈر تو لگتا ہے بہت تیرگیِ فردا سے
پیچھے ہٹنا بھی نہیں خیر وتیرہ اپنا

بادبانوں پہ بھروسے کا یہ نکلا انجام
آگیا ہاتھ ہواؤں کے سفینہ اپنا

مشغلہ کسبِ ہنر پہلے کبھی ہوتا تھا
بیچنا علم وہنر اب ہے ذریعہ اپنا

مسلکِ کُل کو نہیں جانتے ہم کیا ہے ظہیرؔ
بات جو سچ ہے وہی بات عقیدہ اپنا

(۲۰۰۵)

قطعہ

جل بجھے ہم تو ہوا ایک زمانہ واقف
واقعہ اپنے بکھرنے کا سبھی نے دیکھا
لوگ پتھر تھے یا پھر ہم تھے شہاب ثاقب
ٹوٹ کر گرنے سے پہلے نہ کسی نے دیکھا

(۲۰۰۵)

رخصتی

راحتِ جاں ناز پرور سب مسرّت تم سے ہے
افتخار و شادمانی کی یہ دولت تم سے ہے
خانۂ آباد کی یہ شان و شوکت تم سے ہے
رونقِ بزمِ عروسی کی ضمانت تم سے ہے

محفلِ شادی کی رونق دائمی ہو شاد باد
رنگِ عشرت سے مزیّن آرسی ہو شاد باد
آنے والی زندگی کی ہرگھڑی ہو شاد باد
اک نئے جیون کی خاطر رخصتی ہو شاد باد

دیر تک تازہ گلابوں کی مہک باقی رہے
پھول چہرے پر تبسم کی دھنک باقی رہے
عمر بھر تابندہ سہرے کی چمک باقی رہے
اِن سہاگن چوڑیوں کی ہر کھنک باقی رہے

ہو مبارک تم کو اپنی زندگانی کا سفر
اک نئے بندھن میں دل کی شادمانی کا سفر
اک نئی دنیا میں دشتِ جاودانی کا سفر
رحمتِ حق سے ہو ثابت کامرانی کا سفر

زندگی کے راستے میں آگہی ہو ہر قدم
آرزوئیں کامراں ہوں بس خوشی ہو ہر قدم
جس طرف جاؤ سفر میں روشنی ہو ہر قدم
رشک سے منزل تمہی کو دیکھتی ہو ہر قدم

چاند تاروں سے سجی اِک کہکشاں تم کو ملے
تم جہاں جاؤ مقدّر مہرباں تم کو ملے
ہمسفر کا ساتھ اپنے جاوداں تم کو ملے
بجلیوں سے دُور ہو وہ آشیاں تم کو ملے

آج بچپن کی سکھی سنگت سے ناتا توڑ کر
اپنے پیاروں کی رفاقت سے توجہ موڑ کر
اک نئی نسبت سے اپنی ہر تمنا جوڑ کر
اپنے بابل کے بھرے گھر کو اکیلا چھوڑ کر

کہہ رہی ہو الوداع اشکوں بھری آنکھوں کے سنگ
لگ کے سینے رو رہی ہو بھائیوں بہنوں کے سنگ
لو تمہیں رخصت کیا اب اَن کہے لفظوں کے سنگ
جاؤ تم مہماں سرا سے اپنے گھر خوشیوں کے سنگ

میٹھی یادوں کی مہکتی سی ہوائیں اپنے ساتھ
بھولے بچپن کی سنہری سی فضائیں اپنے ساتھ
اپنے دامن میں بھرے گھر کی وفائیں اپنے ساتھ
نورِ دل ماں باپ کی لے جا دعائیں اپنے ساتھ

لو مبارک ہو تمہیں وقتِ سفر اب الوداع
باندھ کر اشکوں کے سب لعل و گہر اب الوداع
جاؤ بابل کے نگر سے اپنے گھر اب الوداع
اے مری دختر مری نورِ نظر اب الوداع

(۲۰۰۵)

بجھتا دیا جو صبح کے آثار میں سے تھا
جب بجھ گیا تو ورثۂ بیکار میں سے تھا

آساں ہوئی ہیں منزلیں ، اچھا ہوا لٹا
رختِ سفر کہ جان کے آزار میں سے تھا

خنجر مرا تھا ہاتھ میں اُس کے ، سپر مری
نکلا مگر وہ لشکرِ اغیار میں سے تھا

زنداں لگا مجھے تو یہ دورانِ زندگی
سارا نظارہ روزنِ دیوار میں سے تھا

نوکِ قلم سے گر کے کہیں کھو گیا ظہیرؔ
اک حرف جو خزینۂ اسرار میں سے تھا

(۲۰۰۶)

نظریں چُرائیے ، نہ ندامت اٹھائیے
جتنے بچے ہیں سنگِ ملامت ، اٹھائیے

مصلوب کیجئے ہمیں ناکردہ جرم پر
معصوم پھر بنا کے سلامت اٹھائیے

یہ ٹیڑھے ترچھے وار ہیں توہینِ عاشقی
تیغِ ستم کو برسرِ قامت اٹھائیے

اِس تہمتِ جفا سے بھی آگے ہیں مرحلے
اتنی سی بات پر نہ قیامت اٹھائیے

تکلیف دیجئے نہ کسی غمگسار کو
احسانِ چارہ گر بھی ذرا مت اٹھائیے

مرتا ہے شہر مہر و محبت کے قحط سے
خاصانِ خلق دستِ کرامت اٹھائیے

نادم کھڑے ہیں سارے گنہگار منتظر
بڑھ کر ظہیرؔ بارِ امامت اٹھائیے

(۲۰۰۶)

جس خاک سے بنے تھے ہم اُس خاک پر گرے
شاخِ شجر سے ٹوٹ کے جیسے ثمر گرے

سونپی ہیں راہِ شوق نے وہ وہ امانتیں
کاندھوں سے رہ نورد کے زادِ سفر گرے

آیا ہے کس کا نام یہ نوکِ قلم پر آج
کاغذ پر آ کے سینکڑوں شمس و قمر گرے

خاشاک بن گئے ہیں ہواؤں کے ہاتھ میں
اپنی جڑوں سے ٹوٹ کے جتنے شجر گرے

گھر ٹوٹنے کا سانحہ عریاں سا کر گیا
جامے گرے بدن سے کہ دیوار و در گرے

پرچم نہیں ہے ، ورثۂ اسلاف ہے ظہیرؔ
پرچم گرا تو جانیئے پُرکھوں کے سر گرے

(اگست ۲۰۰۶)

خواب آنکھوں میں کیئے ایسے کسی نے روشن
بحرِ ظلمت میں رواں جیسے سفینے روشن

چند لمحے جو ترے نام کے مل جاتے ہیں روز
اُن کے دم سے ہیں مرے سال مہینے روشن

کسی جلوے کی کرامت ہے یہ چشمِ بینا
کسی دہلیز کا احسان جبینِ روشن

میرے اشکوں میں عقیدت کے جہاں ہیں آباد
آنکھ میں رہتے ہیں کچھ مکّے مدینے روشن

ہاتھ محنت کے ملیں ، آنکھ محبت کی اگر
تبھی کرتی ہے زمین اپنے خزینے روشن

یوں تو دنیا نے جلائے کئی پانی پہ چراغ
دیپ کاغذ پہ کیئے ایک ہمی نے روشن

شب کدہ رشکِ چراغاں ہے کہ جس میں ہر سُو
ہوگئے تیری محبت کے قرینے روشن

(۲۰۰۶)

اشکِ کم ظرف مرا ضبط ڈبو کر نکلا
میں جسے قطرہ سمجھتا تھا سمندر نکلا

جذبۂ شوقِ نظارہ بھی مری آنکھ میں تھا
حسنِ نظارہ بھی اس آنکھ کے اندر نکلا

بارہا دستِ مسیحا سے بھی کھائے ہیں فریب
ہم نے نشتر جسے سمجھا وہی خنجر نکلا

ہم سمجھتے تھے کہ سادہ ہے محبت کی کتاب
حاشیہ اس میں مگر متن سے بڑھ کر نکلا

مرحلہ جب کوئی ایثار کا آیا سرِ بزم
قرعۂ فال مرے نام کا اکثر نکلا

ایسا آسیب ہے گلیوں میں سنا ہے کہ ظہیرؔ
گھر پلٹ کر نہیں آتا کہ جو باہر نکلا

(۲۰۰۶)

ریت گھڑی

(لمبی اداسی تان کے چپ سو گیا ہے وقت)

ٹھہری ہے ایک نقطے پہ گزرانِ روز و شب
خود اپنی گردشوں میں کہیں کھو گیا ہے وقت
گرتا ہے ریزہ ریزہ سا لمحوں کا ریگزار
شیشے کے ایک ظرف میں گم ہو گیا ہے وقت
اُلٹے گا ریگزار یہ دورانیے کے بعد
پھر سے پلٹ کر آئے گا اب جو گیا ہے وقت

(۲۰۰۶)

مت سمجھو کہ ہجرت کے طلسمات میں گم ہیں
ہم لوگ وفاؤں کے تضادات میں گم ہیں

رستوں میں نہیں سات سمندر کی یہ دوری
یہ سات سمندر تو مری ذات میں گم ہیں

ہم لے کے کہاں جائیں محبت کا سوال اب
دل والے بھی اپنے ہی مفادات میں گم ہیں

کشکولِ انا کو بھی چٹختا کوئی دیکھے
سب اہلِ کرم لذتِ خیرات میں گم ہیں

الفاظ دریچے ہیں جو کھلتے ہیں دلوں میں
معنی مرے سامع کے خیالات میں گم ہیں

(اکتوبر ٢٠٠٦)

عاشقیِ کارِ جنوں اور بھی دے گی آگے
بات اب دار و رسن سے بھی بڑھے گی آگے

کچھ خریدا جو نہیں فکر کے بازار سے آج
قیمت اس کی بھی ادا کرنی پڑے گی آگے

آج بھی چپ رہے لوگو تو ستائے گا سفر
بازگشت ان کہے لفظوں کی ملے گی آگے

کہتے کہتے جو اگر رک بھی گئے ہم ، کیا غم!
داستاں ایسی ہے خود خلق کہے گی آگے

خود بخود ہوتے چلے جائیں گے رستے روشن
مشعلِ نام محمدؐ جو رہے گی آگے

تازہ لہجے میں وہ گم گشتہ پرانے الفاظ
یہ روایت بھی غزل سے ہی چلے گی آگے

(٢٠٠٦)

نظمِ نو آ گیا ، انصاف نرالا دیگا
بیچ کر مجھ کو مرے منہ میں نوالا دیگا

فرق مٹ تو گئے مابینِ سفید و سیہ اب
اور کتنا یہ نیا دور اُجالا دیگا

جس کی خاطر میں نے پہچان گنوائی اپنی
اب وہی میرے تشخص کو حوالہ دیگا

سر جھکاتا ہے پذیرائی کے انداز میں آج
کل یہی شہر ہمیں دیس نکالا دیگا

اور کیا دیگا تجھے بندۂ حاجت اے خدا
نذر میں اپنا یہی خالی پیالہ دیگا

گنگنائے گا مرا شعر ہر اک صاحبِ ذوق
اور مجھے دادِ سخن سوچنے والا دیگا

(۲۰۰۶)

لب پہ شکوہ بھی نہیں ، آنکھ میں آنسو بھی نہیں
مجھ سے دل کھول کے لگتا ہے ملا تو بھی نہیں

اُن کی آنکھوں کے ستارے توبہت دور کی بات
ہم وہاں ہیں کہ جہاں یاد کے جگنو بھی نہیں

جب سے گردن میں نہیں ہے کوئی بانہوں کی کمان
میرے سینے میں کوئی تیر ترازو بھی نہیں

یا تو ماضی کی مہک ہے یا کشش مٹی کی
ورنہ اُن گلیوں میں ایسا کوئی جادو بھی نہیں

رات کی بات تھی شاید وہ نشہ اور جادو
دن چڑھے رات کی رانی میں وہ خوشبو بھی نہیں

(۲۰۰۷)

میں روز اپنے لئے ضابطے بناتا ہوں
پھر اُن کو توڑتا ہوں اور نئے بناتا ہوں

پہنچ بھی جاؤں کہیں میں تو گھر نہیں کرتا
نئے سفر کیلئے راستے بناتا ہوں

مقیمِ دل ہوں میں ، امید نام ہے میرا
میں خواب بُنتا ہوں اور واقعے بناتا ہوں

میں ٹکڑے جوڑ کے ٹوٹے ہوئے چراغوں کے
ہوا کے سامنے بیٹھا دیئے بناتا ہوں

بس ایک سنگِ ندامت ہے اب مری توفیق
میں پانی تکتا ہوں اور دائرے بناتا ہوں

نہ سنگِ میل ، نہ منزل ، نہ رہنما ، میں تو
ستارے دیکھتا ہوں ، زائچے بناتا ہوں

مجھے خبر ہے کہ جانا مجھے اکیلا ہے
تو پھر یہ قافلہ کس کے لئے بناتا ہوں؟

(۲۰۰۷)

بجھتے بجھتے بھی اندھیروں میں کرن چھوڑ گیا
وہ مرا شوخ ستارہ جو گگن چھوڑ گیا

خواب تو خواب مجھے نیند سے ڈر لگتا ہے
جانے والا مری پلکوں پہ شکن چھوڑ گیا

اُس نے بھی چھوڑ دیا مجھ کو زمانے کیلئے
جس کی خاطر میں زمانے کے جتن چھوڑ گیا

کسی زیور کی طرح اُس نے نکھارا مجھ کو
پھر کسی اور کی جھولی میں یہ دَھن چھوڑ گیا

دے رہا ہے مجھے پسپائی کے طعنے وہ بھی
میری رفتار میں جو اپنی تھکن چھوڑ گیا

بھول جانے کی قسم لے گیا وہ رشکِ گلاب
یاد رکھنے کو مہک ، رنگ ، چبھن چھوڑ گیا

دستکِ دستِ طلب بس میں نہیں تھی اس کے
سو میں دہلیز پہ خود اپنا بدن چھوڑ گیا

نہ کوئی آگ لگائی ، نہ ڈھلا پانی میں
کیسا آنسو تھا کہ آنکھوں میں جلن چھوڑ گیا

تھک کے بیٹھا تھا برابر میں کوئی پاس مرے
اورمرے کاندھے پہ برسوں کی تھکن چھوڑ گیا

(۲۰۰۷)

زندگی دشتِ انا ہے یہاں کس کا سایا
اپنے سائے کے علاوہ نہیں ملتا سایا

دور جائیں جو شجر سے تو جھلس جانے کا ڈر
چھاؤں میں بیٹھیں تو اپنا نہیں بنتا سایا

بڑھ گئی میری تھکن اور بھی اے شہر امان
آزما کر تری دیوار کا دیکھا سایا

عکس شیشے کے گھروں میں نظر آتے ہیں ہزار
دھوپ آجائے تو ڈھونڈے نہیں ملتا سایا

اُس کے آنچل کی دھنک کو تو ذرا کُھلنے دو
جلتا سورج بھی پکارے گا کہ سایا سایا

ایک دیوارِ عداوت تھی کہ گرتے گرتے
شہر میں چھوڑ گئی خوف کا گہرا سایا

جب بھی کاندھے پہ اٹھاتا ہوں میں بچوں کو ظہیرؔ
میری قامت سے بھی بڑھ جاتا ہے میرا سایا

(جولائی ۲۰۰۷)

نہ سیم و زر نہ گہر بیچ کر ادا ہوگا
وفا کا قرض ہے ، سر بیچ کر ادا ہوگا

زمیں کا قرض ہے جتنا مری اڑانوں پر
غرورِ بازو و پر بیچ کر ادا ہوگا

چکانے نکلا ہوں میں کاسۂ گدائی لئے
جو قرض کاسۂ سر بیچ کر ادا ہوگا

لبوں سے حرفِ محبت بہ لہجۂ تسلیم
متاعِ قلب و جگر بیچ کر ادا ہوگا

ہے یرغمالِ ضرورت جو دل تو پھر تاوان
انا کو بارِ دگر بیچ کر ادا ہوگا

محبتوں کے سفر میں ظہیرؔ حقِ سفر
تمام زادِ سفر بیچ کر ادا ہوگا

(۲۰۰۷)

دل تو پتھر ہوئے ، غم پھر بھی کسک دیتے ہیں
آگ اتنی ہو تو پتھر بھی چمک دیتے ہیں

خاک گرتی ہے جو سر پر غمِ دنیا کی کبھی
نام لے کر ترا ہولے سے جھٹک دیتے ہیں

زندگی جب بھی نظر آتی ہے عریاں اپنی
ہم ترے درد کی پوشاک سے ڈھک دیتے ہیں

یاد کے پھول کتابوں میں دبے رہنے دو
خشک ہوجائیں تو کچھ اور مہک دیتے ہیں

جو نہ بادل میں رہیں اور نہ زمیں پر برسیں
وہی قطرے تو فضاؤں کو دھنک دیتے ہیں

جب سے آئی ہیں مری آنکھوں میں نظریں اس کی
گھپ اندھیرے بھی اجالوں کی چمک دیتے ہیں

مجھ کو چہروں پہ نظر آتی ہے رفتارِ زماں
گھر کے آئینے زمانے کی جھلک دیتے ہیں

(۲۰۰۸)

اِس کی بنیاد میں پتھر ہے پرانے گھر کا
قرض کتنا نئے گھر پر ہے پرانے گھر کا

چین سے سوتا ہوں یادوں کا بنا کر تکیہ
راس اب تک مجھے بستر ہے پرانے گھر کا

دوستو! میں تو نہیں بدلا ہوں گھر بدلا ہے
نئی چوکھٹ میں کُھلا در ہے پرانے گھر کا

نئی بستی کا کبھی نقطۂ آغاز تھا یہ
شہر کے بیچ جو منظر ہے پرانے گھر کا

اِس نئے شہر کے موسم سے بہت ڈرتا ہے
آدمی جو مرے اندر ہے پرانے گھر کا

ویسے تو خوش نظر آتا ہے نئے گھر میں ظہیرؔ
تذکرہ باتوں میں اکثر ہے پرانے گھر کا

(۲۰۰۸)

میرا سفر ہے ضبطِ مسلسل کی قید میں
چھوٹی سی جیسے کشتی ہو بوتل کی قید میں

اپنے بدن کی آگ میں جل کر مہک اٹھی
خوشبو جو بیقرار تھی صندل کی قید میں

اے فصلِ تشنہ کام نویدِ رہائی دے
پانی کو دیکھ کب سے ہے بادل کی قید میں

گہرائی اُس کے ضبطِ الم کی بھی دیکھئے
ساگر رکھے ہوئے ہے جو کاجل کی قید میں

آوارہ اک ورق تھا ، مجھے دے دیا ثبات
اُس نے گرہ سے باندھ کے آنچل کی قید میں

بچپن کے آنگنوں سے بچھڑنے کا دُکھ ظہیرؔ
آسیب بن کے رہتا ہے پیپل کی قید میں

(۲۰۰۸)

کوئی بھی آگ ہو ، شانہ بشانہ جلتا ہے
وہ میرے ساتھ ہے جب سے ، زمانہ جلتا ہے

کوئی تو رہتا ہے دل کے کھنڈر مکانوں میں
چراغ شام کو اکثر پرانا جلتا ہے

دراز دستیِ بادِ ستم کا شکوہ کیا
چراغ یادوں میں اب جاودانہ جلتا ہے

یہ انتظار شبستانِ دل میں ہے کس کا
نہ بجھ کے دیتا ہے کوئی دیا ، نہ جلتا ہے

ہمارے شہر میں قیمت ہے روشنی پہ ابھی
دیا جلائیں تو پہلے ٹھکانہ جلتا ہے

وہ تیرِ عشق جو پیوستِ جاں ہوا تھا کبھی
نکل گیا ، مگر اب تک نشانہ جلتا ہے

ذرا خیال سے چُھونا ظہیرؔ شاخِ نہال
گلابِ سرخ نہیں ، آشیانہ جلتا ہے

(فروری ۲۰۰۸)

زندہ حقیقتوں سے چھپایا گیا ہمیں
ماضی کی داستاں میں بسایا گیا ہمیں

چھینا گیا لبوں سے تبسم بنامِ سوز
قصے کہانیوں پہ رُلایا گیا ہمیں

اپنے سوا ہر عکس ہی بگڑا ہوا لگا
آئینہ اِس طرح سے دکھایا گیا ہمیں

پہلے تو ایک درسِ اخوّت دیا گیا
پھر حرفِ اختلاف پڑھایا گیا ہمیں

کانوں میں زہرِ کفر انڈیلا گیا ہے روز
پھر کلمۂ یقین سنایا گیا ہمیں

اُٹھ کر پتہ چلا کہ قیامت گزر چکی
ایسا تھپک تھپک کے سُلایا گیا ہمیں

دوزخ کی آگ بھوک بدن سے لپیٹ کر
وعدہ بہشت کا بھی دلایا گیا ہمیں

تقریبِ دوستاں میں ستم در ستم ہوا
تعظیمِ دشمناں میں اٹھایا گیا ہمیں

پیشانیوں پہ قیمتیں لکھ کر مثالِ جنس
بے حد و بے حساب کمایا گیا ہمیں

پانی نہیں تھے خون پسینہ تھے ہم ظہیرؔ
سیراب بستیوں میں بہایا گیا ہمیں

(۲۰۰۸)

سب کاروبارِ نقد و نظر چھوڑنا پڑا
بکنے لگے قلم تو ہُنر چھوڑنا پڑا

قربانی مانگتی تھی ہر اک شاخِ بے ثمر
بسنے نہ پائے تھے کہ شجر چھوڑنا پڑا

کرنا تھا جو سفر ہمیں ، ہم نے نہیں کیا
بچوں کو آج اس لئے گھر چھوڑنا پڑا

آ تو گئے ہو ، سوچ لو جاؤ گے پھر کہاں
یہ شہر بد لحاظ اگر چھوڑنا پڑا

گھر سے چلا تھا بارِ ثقافت اٹھا کے میں
رستے میں تھوڑا تھوڑا مگر چھوڑنا پڑا

نفرت کے سانپ آ گئے گھر تک تو میں ظہیرؔ
اتنا ڈرا کہ خوفِ سفر چھوڑنا پڑا

(۲۰۰۸)

(وطنِ عزیز میں الیکشن کے موقع پر)

حلیفِ ظلمتِ شب تار ہم نہیں ہونگے
سحر سے برسرِ پیکار ہم نہیں ہونگے

یہ خوابِ غفلتِ بیخود ہمیں گوارا ہے
فروغِ جبر میں بیدار ہم نہیں ہونگے

ہمیں عزیز ہے حرمت جہادِ منزل کی
شریکِ کاوشِ بیزار ہم نہیں ہونگے

کسی حریفِ ستمگر کی پیشوائی میں
شریکِ مجمعِ اغیار ہم نہیں ہونگے

سجاؤ سر پہ کسی کے بھی تاجِ سلطانی
نقیبِ شوکتِ دربار ہم نہیں ہونگے

جہاں میں عظمتِ کردار کے ہیں قائل ہم
قتیلِ گرمیِ گفتار ہم نہیں ہونگے

بکی ہے گرچہ حمایت ہماری ہر عنوان
رہینِ جبۂ و دستار ہم نہیں ہونگے

اگر نہ بن سکے مظلوم کی سِپر نہ سہی
ستم کے ہاتھ میں تلوار ہم نہیں ہونگے

اگر ہے قیمتِ گویائی درد کی تشہیر
تو پھر سے تشنۂ اظہار ہم نہیں ہونگے

جمالِ خرقۂ درویشی ہے نظر میں ظہیرؔ
اسیر طرّۂ خمدار ہم نہیں ہونگے

(۲۰۰۸)

دل کو ٹٹولئے ، کوئی ارمان ڈھونڈیئے
پھر سے کسی نظر میں پرستان ڈھونڈیئے

یونہی گزر نہ جائے یہ موسم شباب کا
آرائشِ حیات کا سامان ڈھونڈیئے

کب تک گلاب ہاتھ میں لیکر پھریں گے آپ
موسم بہت شدید ہے گلدان ڈھونڈیئے

دیوار ہی گری ہے ، یہ بازو نہیں گرے
ملبہ اٹھا کے سائے کا امکان ڈھونڈیے

اٹھتی ہے اک صدا سی مشینوں کے شور میں
ہو گا یہیں کہیں کوئی انسان ، ڈھونڈیئے

ملیے کبھی اکیلے میں خود اپنے آپ سے
سارے نقاب اُتار کے پہچان ڈھونڈیئے

(۲۰۰۸)

قطعہ

حوصلہ قافلے والوں کا بڑھاتے رہنا
منزلیں دور ہیں قدموں کو ہلاتے رہنا
میں حدی خواں ہوں مرا کام صدائیں کرنا
میری آواز میں آواز ملاتے رہنا

(۲۰۰۸)

مانا کہ عرضِ حال کے قائل نہیں تھے ہم
سمجھے نہ کوئی ایسی بھی مشکل نہیں تھے ہم

کچھ ہوگئیں خطائیں تو معذور جانئے
انسان ہی تھے جوہرِ کامل نہیں تھے ہم

اپنے ہی شہر میں ہمیں مہماں بنادیا
اتنی مدارتوں کے تو قابل نہیں تھے ہم

طوفاں ملے جو ہم سے تو شکوہ نہ کیجئے
اک بحرِ اضطراب تھے ساحل نہیں تھے ہم

مٹ جاتے ایک موجِ گریزاں کے زور سے
نقشِ قدم تو برسرِ ساحل نہیں تھے ہم

۔ق۔

ہم اُٹھ گئے تو ہوگئی برہم بساط کیوں؟
اک ہم نشیں تھے رونقِ محفل نہیں تھے ہم

ہم کھوگئے تو رُک گئے کیوں اہلِ کارواں؟
اک ہمسفر تھے جادۂ منزل نہیں تھے ہم

-

ہر موڑ پر ٹھہر کے کریں راستے کی جانچ
اس درجہ احتیاط کے قائل نہیں تھے ہم

غفلت جو تھی اگر تو بس اپنے ہی حال سے
حالت سے دوستوں کی تو غافل نہیں تھے ہم

خوابوں کی آبرو بھی پسِ پشت ڈال دیں
اتنے بھی زیرِ بارِ مسائل نہیں تھے ہم

گزری تو خیر جیسی بھی لیکن لگا ہمیں
اُس انتظارِ زیست کا حاصل نہیں تھے ہم

شکوہ نہیں ہے بابِ اثر سے ہمیں ظہیرؔ
اپنی دعائے خیر میں شامل نہیں تھے ہم

(۲۰۰۸)

ہوئے مسند نشیں پھر ملک و ملت بیچنے والے
بنا کر بھیس زرداروں کا غربت بیچنے والے

خدا حافظ بزرگوں کی امانت کا خدا حافظ
محافظ ہوگئے گھر کے ، وراثت بیچنے والے

زمیں ملکِ خدا میں ہوگئی تنگ اب کہاں جائیں
کدالیں تھام کر ہاتھوں میں محنت بیچنے والے

خزانے میری مٹی کے عجب ہیں کم نہیں ہوتے
مسلسل بیچتے ہیں بے رعایت بیچنے والے

قلم کی روشنائی کر رہے ہیں صرفِ آرائش
صحافت کی دکانوں میں سیاست بیچنے والے

مٹاکر تو دکھائیں پہلے کالک اپنے چہروں کی
بنامِ صبح روشن تر یہ ظلمت بیچنے والے

دل وجاں برطرف ، بکتے رہیں گے دین و ایماں بھی
خریداروں کی دنیا میں سلامت بیچنے والے

منافق ہوگئی میری سماعت بھی ظہیرؔ آخر
پسند آئے سرِ منبر خطابت بیچنے والے

(۲۰۰۸)

لوگ مصروفِ خدائی ہیں خدا کے گھر میں
بندہ توبہ کرے مسجد سے اب آ کے گھر میں

پُل بنانے میں تھے مصروف ، یہ معلوم نہ تھا
دریا آ جائے گا دیواریں گرا کے گھر میں

اتنا گھبرا ئے گھٹن سے کہ ہم ایسے محتاط
آ گئے لے کے دیا اپنا ہوا کے گھر میں

کھوٹا سکہ تو نہیں ہے یہ محبت لوگو!
آزماؤ اِسے ، رکھو نہ چھپا کے گھر میں

میں نکلتا ہوں غمِ دنیا پہن کر ہر صبح
نوچ دیتا ہوں اسے شام کو جا کے گھر میں

آپ کے در سے کہیں اُٹھ کے نہ جاؤں مولا
کیجئے مجھ سے سلوک ایسا بُلا کے گھر میں

(۲۰۰۸)

سایۂ نخلِ ثمر بار نہیں آیا پھر
گھر سے نکلے تو چمن زار نہیں آیا پھر

پھر مجھے خاکِ جنوں لے کے پھری دشت بہ دشت
وہ ترا شہر خوش آثار نہیں آیا پھر

تم نے تو دام لگا کر یونہی بس چھوڑ دیا
میرے خوابوں کا خریدار نہیں آیا پھر

بجھ گئی جلتی ہوئی دھوپ تو ہمسایوں کے بیچ
قضیۂ سایۂ دیوار نہیں آیا پھر

جانے اب شہر کا کیا رنگ ہے ، کیا عالم ہے؟
آج دروازے پر اخبار نہیں آیا پھر

سلسلہ اُن سے تکلم کا جو ٹوٹا تو ظہیرؔ
بزم میں تشنۂ اظہار نہیں آیا پھر

(۲۰۰۸)

اک بات کہہ رہا ہوں لہجے بدل بدل کے
اک شعر ہو رہا ہے مصرعے بدل بدل کے

پُرپیچ راستہ ہے ، سامان ہلکا رکھنا
تھک جاؤ گے وگرنہ کاندھے بدل بدل کے

تاریکیوں سے گذرا میں روشنی کی خاطر
پہنچا تری ڈگر پر رستے بدل بدل کے

تعبیر کیا ملے گی اُن کو بھلا سحر سے
گزری ہے رات جن کی سپنے بدل بدل کے

آئینۂ طلسمِ ایوانِ اختیارات !
اک شخص دیکھتا ہے چہرے بدل بدل کے

تاریخ بھی ہماری لکھی ظہیرؔ اُسی نے
لوگوں کو جس نے بانٹا نقشے بدل بدل کے

(۲۰۰۸)

قطبی رات

دل کہ اک جزیرہ ہے
گھرے سرد پانی میں
منجمد سفینہ ہے
درد کی روانی میں
برف سارا عالم ہے
سرمئی سے موسم میں
منجمد سے روز و شب
کُہر کے نقابوں سے
چہرہ تکتے رہتے ہیں
اجنبی زبانوں میں
اَن کہی سی کہتے ہیں
اک طرف شمال کی
ہفت رنگ روشنی
آرزو کے پردے پر
رنگ رنگ خوابوں کا
جال بُنتی رہتی ہے
آس لکھتی رہتی ہے

دل میں جھانک کر میرے
چپکے چپکے کہتی ہے
رات پھر بھی رات ہے
رات کی شکا یت تو
ناروا سی بات ہے
گرچہ ناروائی میں
ناروے کی رات ہے
وقت ہی تو ہے آخر
وقت بیت جاتا ہے
درد جتنا ظالم ہو
صبر جیت جاتا ہے
بے لحاظ ہے موسم
بے زوال تو نہیں
دوریوں کے ماہ و سال
نوری سال تو نہیں
گردشِ زماں نہیں
گردشِ زمین ہے
صبح کے نکلنے کا
تم کو تو یقین ہے
کچھ ہی روز باقی ہیں

برف کے پگھلنے میں
تیرگی کے پردے سے
نور کے نکلنے میں
رات کا تماشا اب
کچھ ہی دیر ہونا ہے
اس کے بعد ہر طرف
روشنی کا سونا ہے

(۲۰۰۸)

مٹی سنوار کر مری ، دیپک میں ڈھال دے
مجھ کو جلا کے پھر مری دنیا اُجال دے

مجھ کو اُٹھا کے رکھ کسی طوفاں کی آنکھ میں
ہر موجِ مضطرب مرے سر سے اچھال دے

ٹکرادے حوصلہ مرا آلامِ زیست سے
مرنے کی آرزو کو بھی دل سے نکال دے

پامال راستوں سے ہٹا کر مرے قدم
نایافت منزلوں کے اشارے پہ ڈال دے

اک مستعار آگہی اُلجھا گئی ہے ذہن
دے مجھ کو سوچ میری اور اپنا خیال دے

خاموشیوں کے دہر میں لائے جو ارتعاش
مجبور مصلحت کو وہ حرفِ مجال دے

(۲۰۰۸)

جہاں پر آبِ رواں سے چٹان ملتی ہے
وہیں سے موج کو اکثر اٹھان ملتی ہے

جہاں بھی دستِ توکل نے کچھ نہیں چھوڑا
وہیں سے دولتِ کون و مکان ملتی ہے

جو قفلِ ذات کرے ضربِ عشق سے دو نیم
اُسے کلیدِ زمان و مکان ملتی ہے

کریں گمان تو جاتی ہے دولتِ ایمان
رہے یقین تو پھر بے گمان ملتی ہے

اُسی کا سر سرِ نیزہ پہ رکھا جا تا ہے
مرے قبیلے میں جس کو کمان ملتی ہے

فشارِ درد سے ہوتا ہے میرا خامہ رواں
دہانِ زخم کو گویا زبان ملتی ہے

زمانہ اب وہ کہاں زورِ بال و پر کا ظہیرؔ
ہوا سے دوستی ہو تو اڑان ملتی ہے

(۲۰۰۸)

زندہ ہزاروں لوگ جہاں مر کے ہوگئے
ہم بھی خدا کا شکر اُسی در کے ہوگئے

جو راس تھا ہمیں وہی قسمت نے لکھ دیا
ہم جور آشنا تھے ستم گر کے ہوگئے

نکلے تھے ہم جزیرۂ زر کی تلاش میں
ساحل کی ریت چھوڑ کے ساگر کے ہوگئے

کچھ ایسا رائگانیِ دستک کا خوف تھا
پہلا جو در کھلا ہم اُسی در کے ہوگئے

میرے ستم گروں کا بھی معیار بڑھ گیا
پتھر جو مجھ پر آتے تھے مرمر کے ہوگئے

بالیدگی ہوائے سیاست کی دیکھنا!
بالشتیئے اک آن میں گز بھر کے ہوگئے

کرنے لگے ہیں وہ بھی لو بچپن کو اپنے یاد
بچّے ظہیرؔ میرے برابر کے ہوگئے

(۲۰۰۸)

ماں کے دامن کی طرح پھیلا ہے خالی آنگن
گھر کی دہلیز پہ بیٹھا ہے سوالی آنگن

لمس باقی نہ رہے پھول کھلانے والے
منتظر ہے لئے سوکھی ہوئی ڈالی آنگن

گھر کے دامن سے تو ملتے ہیں کئی گل کئی خار
صرف افسانوں میں ہوتے ہیں مثالی آنگن

وسعتیں دیتا ہے کتنی مرے چھوٹے گھر کو
دل میں آباد ہے اب تک جو خیالی آنگن

وہ بلاتا ہے مجھے اُس کا کرم ہے ورنہ
میں کہاں اور کہاں کعبے کا عالی آنگن

(اپریل۲۰۰۹)

کچھ جرم نئے اور مرے نام لگا دو
باقی ہے اگر کوئی تو الزام لگا دو

کیوں کرتے ہو دربارِ عدالت کا تکلف
جو حکم لگانا ہے سرِ عام لگا دو

افسانہ ہمارا ہے ، قلم سارے تمہارے
عنوان جو چاہو بصد آرام لگا دو

دیوانوں کو پابندِ سلاسل نہ کرو تم
ذہنوں میں بس اندیشۂ انجام لگا دو

جب آہی گئے برسرِ بازار تو کیا شرم
اوروں کی طرح تم بھی مرے دام لگا دو

جل اٹھے تو جل جائے گا یہ پردۂ شب تار
پابندی چراغوں پہ سرِ شام لگا دو

غیرت ہی نہیں باقی تو بیکار ہیں ہتھیار
مل جائیں خریدار تو نیلام لگا دو

(۲۰۰۹)

اس خاک سے جو ربطِ وفا کاٹ رہے ہیں
پرواز کی خواہش میں سزا کاٹ رہے ہیں

اس روزِخوش آثار کی سچائی تو یہ ہے
اک رات سرِ دشتِ بلا کاٹ رہے ہیں

حبس اتنا ہے سینے میں کہ لگتا ہے مسلسل
ہم سانس کے آرے سے ہوا کاٹ رہے ہیں

بیکار کہاں بیٹھے ہیں مصروف ہیں ہم لوگ
ہم اپنی صداؤں کا گلا کاٹ رہے ہیں

خیاطِ قلم بر سرِ بازارِ صحافت
پوشاک کو قامت سے بڑا کاٹ رہے ہیں

ہر روز بدل دیتے ہیں دیوار پہ تحریر
خود اپنے ہی ہاتھوں کا لکھا کاٹ رہے ہیں

ٹکراتے ہیں موجوں کی طرح سنگِ ستم سے
ہر روز چٹانوں کو ذرا کاٹ رہے ہیں

(۲۰۰۹)

میں بھی کسی کے درد کا درمان بن گیا
ادنیٰ سا آدمی تھا میں انسان بن گیا

اپنی حدیں ملی ہیں تو ادراکِ حق ہوا
عرفانِ ذات باعثِ ایمان بن گیا

ہمسر تھا جبرئیل کا جب تک تھا سجدہ ریز
جیسے ہی سر اٹھایا تو شیطان بن گیا

خیراتِ عشق کیا پڑی کشکولِ ذات میں
اتنے کھلے گلاب کہ گلدان بن گیا

کچھ بھی نہیں تھا کہنے کو شہرِ وصال میں
ہجرت ملی غزل کو تو دیوان بن گیا

پہچانئے مجھے میں وہی ہوں ظہیرؔ، جو
خود کو مٹا کر آپ کی پہچان بن گیا

(۲۰۰۹)

بنا کے پھر مجھے تازہ خبر نہ جاؤ تم
اب آ گئے ہو تو پھر چھوڑ کر نہ جاؤ تم

میں ڈرتے ڈرتے سناتا ہوں اپنے اندیشے
میں کُھل کے یوں نہیں کہتا کہ ڈر نہ جاؤ تم

کہاں کہاں مجھے ڈھونڈو گے پرزہ پرزہ ہوں
مجھے سمیٹنے والے! بکھر نہ جاؤ تم

بڑھے ہو تم مری جانب تو ڈر یہ لگتا ہے
مرے قریب سے آکر گزر نہ جاؤ تم

خیال و فکر کی سمتیں بدلتی رہتی ہیں
پلٹ سکو نہ جدھر سے اُدھر نہ جاؤ تم

کرو نہ کاوشیں اُن کی نظر میں رہنے کی
ظہیرؔ اُن کی نظر سے اُتر نہ جاؤ تم

(جولائی ۲۰۰۹)

بے سمت کاوشوں کا ثمر دائرے میں ہے
محور نہیں ہے پھر بھی سفر دائرے میں ہے

دُہرا رہے ہیں خود کو عروج و زوالِ دہر
عالم تمام زیر و زبر دائرے میں ہے

کہنے کو انجمن ہے شریکِ سخن ہیں لوگ
ہر شخص اپنے اپنے مگر دائرے میں ہے

سونپی تھی رازدان کو ، آ پہنچی مجھ تلک
معلوم یہ ہوا کہ خبر دائرے میں ہے

رستے ہیں شہرِ حرص میں آنے کے بے شمار
بس واپسی کی راہ گزر دائرے میں ہے

قائم رہے خدا وہ مرا مرکزِ یقین!
جب تک خرامِ شمس و قمر دائرے میں ہے

جب سے بنا ہوا ہے کوئی قبلۂ خیال
پیہم طوافِ فکر و نظر دائرے میں ہے

خط مرکزِ عدم سے محیطِ وجود تک
جتنا بھی ہو طویل مگر دائرے میں ہے

خامہ ترا رواں ہے یہ کس راہ پر ظہیرؔ
لگتا ہے نقشِ پائے ہنر دائرے میں ہے

(۲۰۰۹)

ہم ترا ذکرِ طرحدار لکھا کرتے تھے
کوئی روکے تو بہ تکرار لکھا کرتے تھے

پندِ ناصح جو کہیں لکھا نظر آ جائے
نام تیرا وہیں سو بار لکھا کرتے تھے

محضرِ جرمِ وفا پر بخطِ رسمِ جلی
برملا کلمۂ اقرار لکھا کرتے تھے

فردِ تکفیر ہمیں ملتی تھی جس کاغذ پر
ہم اُسی پر ترے اشعار لکھا کرتے تھے

ہم نے دیکھا ہی نہ تھا کچھ لب و عارض کے سوا
دل کے زخموں کو بھی گلنار لکھا کرتے تھے

چشمِ سادہ کو بہم آئی تھی وہ خوش نظری
ہم تو صحرا کو بھی گلزار لکھا کرتے تھے

شبِ تیرہ کے اُلجھتے ہوئے پیچ و خم کو
سایۂ گیسوئے خم دار لکھا کرتے تھے

طفلِ مکتب تھے ، دوانے تھے کہ ہم فرزانے
دل کی باتیں سرِ دیوار لکھا کرتے تھے

مختصر یہ کہ جو لکھتے تھے لہو سے اپنے
لوگ کہتے ہیں کہ بیکار لکھا کرتے تھے

معتبر ٹھہرے وہی حرفِ ضرورت کہ جنہیں
لکھنے والے سرِ دربار لکھا کرتے تھے

جانے کس شہرِ خموشی میں ہوئے خوابیدہ
جو سخن خامۂ بیدار لکھا کرتے تھے

مر گئے کب کے وہ دل میں لئے امیدِ جواب
خط مسیحا کو جو بیمار لکھا کرتے تھے

ڈر رہے ہیں اب اُسی عہدِ ترقی سے ظہیرؔ
جس کی آمد کے ہم آثار لکھا کرتے تھے

(۲۰۰۹)

کسی بھی عشق کو ہم حرزِ جاں بنا نہ سکے
انا کا بوجھ تھا اتنا کہ کچھ اٹھا نہ سکے

فصیلیں ساری گرادیں جو درمیان میں تھیں
دلوں کے بیچ کی دیوار ہی گرا نہ سکے

ہزار حرفِ خوش آہنگ تھے بہم لیکن
مزاجِ کلک کی تلخی کبھی چھپا نہ سکے

سبھی کے غم کئے تصویر ہم نے شعروں میں
کسی کے غم کا مداوا مگر بتا نہ سکے

سبھی کو آئنہ توفیق بھر دیا ہم نے
خود اپنے عکس پہ نظریں کبھی جما نہ سکے

دلوں کا حال خدا جانتا ہے خوب ظہیرؔ
خدا گواہ کہ تم ہی کبھی نبھا نہ سکے

(۲۰۰۹)

کارِ وفا محال تھا ، ناکام رہ گیا
قصّہ مرا بھی تشنۂ انجام رہ گیا

شب کو بھی میں چھڑا نہ سکا رہنِ درد سے
دن بھی اسیر گردشِ ایّام رہ گیا

ظلماتِ پُرفریب میں اُلجھی رہی نظر
محرومِ دید ماہِ سرِ بام رہ گیا

تصویرِ جاں کو حسرتِ تکمیل ہی رہی
اک نقشِ آرزو تھا کہ بس خام رہ گیا

تکتا ہوں چھوٹ کر بھی کمیں گاہِ دہر کو
دل جیسا اک اسیر تہِ دام رہ گیا

غارت گرِ سخن تھی ہوائے خیالِ ہجر
بجھ کر چراغِ حرف سرِشام رہ گیا

اک خواہشِ دوام کہ تھی ضامنِ کمال
رخصت ہوئی تو نقشِ ہنر خام رہ گیا

ہر تہمتِ جنوں سے تو ہم ہوگئے بَری
سر پر دفاعِ ہوش کا الزام رہ گیا

احوال کیا سنائیں جنابِ ظہیرؔ کا
عرصہ ہوا کہ مر گئے بس نام رہ گیا

(۲۰۰۹)

پھر نورِ محبت لئے خورشیدِ بہاراں
گلشن میں ہمارے بھی کرے عیدِ بہاراں

ہر بار خزاں لُوٹ کے لے جاتی ہے گلشن
ہم از سرِ نو کرتے ہیں امیدِ بہاراں

موسم کی گواہی سنو گلیوں میں نکل کر
ڈھونڈو نہ دریچوں سے اسانیدِ بہاراں

سب رنگ بسنتی ہیں پتنگوں کے فضا میں
اور کالی زمیں کرتی ہے تردیدِ بہاراں

در پر ہے اُگا قفل ، تو دیوار پہ زنجیر
آغاز مرے گھر سے ہے تمہیدِ بہاراں

ہوتا ہے مرا درد بہاروں میں مکرّر
حرفِ غمِ ہجراں پہ ہے تشدیدِ بہاراں

شبنم نہیں ، تکمیلِ نمو کی ہیں یہ مہریں
پھولوں کے ورق پر ہیں اسانیدِ بہاراں

رکھتے ہیں تروتازہ مرے موسمِ دل کو
کچھ خوشبو صفت لوگ صنادیدِ بہاراں

شعروں کے نئے پھول سجانے ہیں غزل میں
کرنی ہے سخن زار میں تجدیدِ بہاراں

(۲۰۱۰)

ملول خاطر و آزردہ دل ، کبیدہ بدن
شبِ وصال میں روتے ہیں غم گزیدہ بدن

علاجِ زخمِ تمنا کو چاہیئے مرہم
قلم کی نوک سے سلتے نہیں دریدہ بدن

اٹھائیں شاہ پہ کیسے ہم انگلیاں لوگو!
جلوسِ شاہ میں عریاں ہیں برگزیدہ بدن

شرف یہ ملتا نہیں ہر کشیدہ قامت کو
کہ اترے دار کے تختے سے سربریدہ بدن

یہ انکساری نہیں بوجھ ہے کوئی سرپر
وہ میرے سامنے آتا تھا کب خمیدہ بدن

گراں ہے ریشم و کمخواب سے ابھی مرہم
سو خوش لباس ہوئے ہیں سبھی دریدہ بدن

ہم ایسے دنیا طلب تھے کہ بیچ کر دل کو
دکانِ سہل پرستی سے جا خریدا بدن

مرے سخن کو وہ دیتا ہے امتحاں کیا کیا
وہ جانِ شعر ، غزل قامت و قصیدہ بدن

(۲۰۱۰)

بے نسب درہم و دینار کا ورثہ کیسا
ہم نہ اپنائیں جو میراث تو حصہ کیسا

نام کی تختی لگانے سے نہ ہوگا ثابت
تم جو گھر پر نہیں موجود تو قبضہ کیسا

دوستی آگ سے کاغذ کی جلا دے گی شہر
پھول رکھئے کفِ قرطاس پہ شعلہ کیسا

میں فقط میں ہوں ، مجھے نسبتِ الفاظ سے جان
مسلکِ لوح و قلم میں کوئی فرقہ کیسا

دو دو چہرے ہیں مگر کوئی پرکھتا ہی نہیں
چل رہا ہے سرِ بازار یہ سکہ کیسا

حرفِ حق پر نہ کٹے گردنِ پندار تو پھر
سجدۂ شب کا جبیں پر کوئی دھبہ کیسا

پُر فتن عہد ہے ، بس روح کو رکھنا آباد
جان جانی ہے تو پھر جان کا خطرہ کیسا

بات پرکھو ، لبِ گفتار نہ پرکھو لوگو!
بات سچی ہے تو سچائی کا شجرہ کیسا

ظلم جو بھی کرے تردید ضروری ہے ظہیرؔ
ظلم اندھیرا ہے تو پھر ظلم کا چہرہ کیسا

(۲۰۱۰)

بازی انا کی ، بھوک سے کیسی بری لگی
بھوکا بُرا لگا ، کبھی روٹی بری لگی

خانہ بدوشیوں کے یہ دکھ بھی عجیب ہیں
چوکھٹ پر اپنے نام کی تختی بری لگی

روشن دریچے کر گئے کچھ اور بھی اداس
صحرا مزاج آنکھ کو بستی بری لگی

دشمن کی ناخدائی گوارا نہ تھی ہمیں
غرقاب ہوتے ہوتے بھی کشتی بری لگی

خود پر دیارِ غیر کی نسبت نہ رکھ سکا
بیٹے کو ماں کے نام کی گالی بری لگی

سیکھا تھا ننگے پیروں سے چلنا جہاں ظہیرؔ
پاپوش مل گئے تو وہ مٹی بری لگی

(۲۰۱۰)

اُسی حوالے سے ہر بار میں نشانہ ہوا
جسے بھلائے ہوئے بھی مجھے زمانہ ہوا

یہ خوئے دربدری تو مرے مزاج میں تھی
کسی کا مل کے بچھڑنا تو اک بہانہ ہوا

نکل سکا نہ اک اندیشۂ فراق سے عشق
خیالِ وصل کبھی حرفِ مدعا نہ ہوا

وفا تو محوِ ستائش تھی اس کو کیا معلوم
جمالِ یار حقیقت سے کب فسانہ ہوا

کسی نرالے سے گاہک کے انتظار میں دل
دکانِ درد پہ رکھے ہوئے پرانا ہوا

کوئی بتائے مجھے کاروانِ عمرِ رواں
کہاں سے آیا ، کدھر ٹھہرا ، کب روانہ ہوا

یہ بستیاں ہیں جو راہوں میں قافلے تھے کبھی
جہاں بھی رک گیا کوئی وہیں ٹھکانہ ہوا

عجیب شہر تھا جس نے دیارِ ہجرت میں
مجھے بنا لیا اپنا مگر مرا نہ ہوا

مری وفاؤں کا سودا مری ضرورت سے
کچھ اس طرح سے ہوا ہے کہ دل بُرا نہ ہوا

(ستمبر ۲۰۱۰)

لوگ کیا کیا گفتگو کے درمیاں کھلنے لگے
ذکرِ یاراں چل پڑا تو رازداں کھلنے لگے

پھر پڑاؤ ڈل گئے یادوں کے شامِ ہجر میں
اور فصیلِ شہرِ جاں پر کارواں کھلنے لگے

تنگ شہروں میں کھلے ساگر کی باتیں کیا چلیں
بادِ ہجرت چل پڑی اور بادباں کھلنے لگے

جب سے دل کا آئنہ شفاف رکھنا آگیا
میری آنکھوں پر کئی عکسِ نہاں کھلنے لگے

دل کی شریانوں میں تازہ غم اک ایسے جم گیا
سب پرانے زخم ہائے بے نشاں کھلنے لگے

تیرے غم کا مہر بستہ گوشوارہ کیا کھلا
عمر بھر کے دفترِ سود و زیاں کھلنے لگے

مدتوں سے ہم نشیں تھے ہم نشاط و ہم طرب
مبتلائے غم ہوا تو مہرباں کھلنے لگے

(٢٠١١_٢٠٢٠)

یہ طبیعت مجھے اپنا نہیں بننے دیتی
جیسے سب ہیں مجھے ویسا نہیں بننے دیتی

آنکھ ایسی ہے کہ دیکھے نہیں جاتے حالات
سوچ ایسی ہے کہ اندھا نہیں بننے دیتی

دُور اندر سے کہیں ایک اُبھرتی ہوئی چیخ
میرے احساس کو بہرا نہیں بننے دیتی

ظلم ایسا ہے کہ دنیا کی زبانیں خاموش
یہ خموشی مجھے گونگا نہیں بننے دیتی

دلِ وحشی مجھے ہونے نہیں دیتا سرسبز
چشمِ گریہ ہے کہ صحرا نہیں بننے دیتی

دشت ایسا ہے کہ چھتنار شجر ہیں ہر گام
دھوپ ایسی ہے کہ سایا نہیں بننے دیتی

خاک ایسی ہے کہ ہر ذرہ طلبگارِ نمو
رُت وہ ظالم کہ شگوفہ نہیں بننے دیتی

شہر ایسا ہے کہ تاحدِ نظر امکانات
بھیڑ ایسی ہے کہ رستہ نہیں بننے دیتی

حرمتِ خامہ وہ ضدی جو کسی قیمت پر
سکۂ حرف کو پیسہ نہیں بننے دیتی

کیا قیامت ہے کہ اب میرے تصور کی تھکن
بادلوں میں کوئی چہرہ نہیں بننے دیتی

میں کسی اور کا بنتا تو منافق ہوتا
یہ انا مجھ کو کسی کا نہیں بننے دیتی

(جولائی ۲۰۱۱)

سادگی ہوئی رخصت ، زندگی کہاں جائے
زندگی کی خاطر اب آدمی کہاں جائے

جرم ہے دیا رکھنا شب پرست گلیوں میں
اس قدر اندھیرا ہے ، روشنی کہاں جائے

ہر طرف مکان اونچے چیختی صداؤں کے
آسمان تکنے کو خامشی کہاں جائے

آنگنوں میں پہرے ہیں رات بھر اجالوں کے
دشت میں نہ جائے تو چاندنی کہاں جائے

سُر تو ساتھ ہولے گا گیت سننے والوں کے
سُر جگا کے چپ ہے جو بانسری کہاں جائے

ریت کے سمندر سے آگئے ہیں برفوں تک
آبِ گم نہیں ملتا تشنگی کہاں جائے

(۲۰۱۱)

نشانِ منزلِ من مجھ میں جلوہ گر ہے تو
مجھے خبر ہی نہیں تھی کہ ہمسفر ہے تو

سفالِ کوزۂ جاں ! دستِ مہر و الفت پر
تجھے گدائی میں رکھوں تو معتبر ہے تو

علاجِ زخمِ تمنا نے مجھ کو مار دیا
کسی کو کیسے بتاؤں کہ چارہ گر ہے تو

چراغِ بامِ تماشہ کو بس بجھادے اب
میں جس مقام پہ بیٹھا ہوں باخبر ہے تو

یہ کس گمان میں لڑتا ہے تو حقیقت سے
یہ کس خیال کے عالم میں گم نظر ہے تو

ترے قدم سے بندھے ہیں ترے زما ن و مکاں
تجھے مقیم سمجھتا تھا دربدر ہے تو

ابھی تو قضیۂ نان و نمک نہیں نبٹا
ابھی سے پائے تمنا کدھر کدھر ہے تو

تری جڑیں کسی مٹی کو ڈھونڈتی ہیں ظہیرؔ
زمینِ زر میں ابھی تک جو بے ثمر ہے تو

(فروری ۲۰۱۱)

میں ہوں چہرہ تری خواہش کا ، مرے بعد تو دیکھ
آئنہ دیکھ تو دانش کا ، مرے بعد تو دیکھ

مجھ پہ ناکامی کے عنوان ابھی سے نہ لگا
تُو نتیجہ مری کاوش کا مرے بعد تو دیکھ

تُو مرے ہاتھ میں بجھتی ہوئی مشعل پہ نہ جا
دُور تک سلسلہ تابش کا مرے بعد تو دیکھ

پیاسی مٹی مجھے پی جائے گی مانا ،لیکن
قطرہ پہلا ہوں میں بارش کا ، مرے بعد تو دیکھ

اب جو بچھڑا ہوں تو روتا ہے وہی سرد مزاج
معجزہ برف میں آتش کا مرے بعد تو دیکھ

مجھ سے کہتا ہے گزرتا ہوا ہر دن یہ ظہیرؔ
چھوڑ دامن مری خواہش کا ، مرے بعد تو دیکھ

(۲۰۱۱)

منظرِ دشتِ تگ و تاز بدل کر دیکھا
رزق کو رفعتِ پرواز بدل کر دیکھا

سلسلہ کوئی ہو انجام وہی ہوتا ہے
ہم نے سو مرتبہ آغاز بدل کر دیکھا

بس وہی ہجر کے سرگم پہ وہی درد کی لے
مطربِ عشق نے کب ساز بدل کر دیکھا

میرے شعروں سے ترے رمز و کنائے نہ گئے
میں نے ہر مصرعۂ غماز بدل کر دیکھا

ہم گدایانِ محبت نے مقدر اپنا
کبھی کاسہ ، کبھی آواز بدل کر دیکھا

دشمنی کیسے بدل دیتی ہے تیور اپنے
معجزہ میں نے یہ ہمراز بدل کر دیکھا

کیا کہیں کیسا تماشہ کوئے جاناں میں ظہیرؔ
یہ لب و لہجہ و انداز بدل کر دیکھا

(۲۰۱۱)

پہاڑ ، دشت ، سمندر ٹھکانے دریا کے
زمیں کو رنگ ملے ہیں بہانے دریا کے

کبھی سمندروں گہرا ، تو ہے کبھی پایاب
بدلتے رہتے ہیں اکثر زمانے دریا کے

سفینہ سب کا سمندر کی سمت میں ہے رواں
مگر لبوں پہ مسلسل ترانے دریا کے

نہیں چٹان کے سینے پہ یوں ہی چادرِ آب
ہیں آبشار کے پیچھے خزانے دریا کے

بھنور کی آنکھ میں آنکھیں یہ ہم نے کیا ڈالیں
ہمی پہ جم گئے سارے نشانے دریا کے

ہمی کو رہنا ہے تشنہ کنارِ دریا پر
تمام جشن بھی ہم کو منانے دریا کے

لہو بہے کہ سیاہی فرات و دجلہ میں
مرے زوال کے قصے ، فسانے دریا کے

دوستی گردش کی میرے ساتھ گہری ہوگئی
دل تھا تو گردشِ حالات گہری ہو گئی

کیسے اندازہ لگاتا اپنی گہرائی کا میں
اپنی تہہ تک جب بھی پہنچا ذات گہری ہو گئی

زندگی نے ہونٹ کھولے لفظ سادہ سے کہے
تجربے نے آنکھ کھولی بات گہری ہو گئی

چاندنی کی آس میں ہم دیر تک بیٹھے رہے
ڈھونڈنے نکلے دیا جب رات گہری ہو گئی

کیا بتاؤں چشمِ نم کا حال اُس کو دیکھ کر
سائباں جب مل گیا برسات گہری ہوگئی

میرے بازی جیتنے پر ہو گئے ناراض دوست
دوستانہ کھیل تھا اور مات گہری ہوگئی

(۲۰۱۱)

(اپنے بیٹے کے لئے)

شاد و آباد رہو ، وقت سدا خوش رکھے
تم جہاں جاؤ تمھیں میری دعا خوش رکھے

فکرِ فردا سے بجھے جاتے تھے دل سینوں میں
حوصلہ تم نے دیا ، تم کو خدا خوش رکھے

پائیدانوں پہ ترقی کے ملے عزت و نام
بامِ شہرت پہ محبت کی ہوا خوش رکھے

آگہی رستہ اُجالے ، تمھیں دیکھے دنیا
سازگاری ملے ، منزل کی فضا خوش رکھے

تم نے ماں باپ کو خوش اپنی سعادت سے کیا
مالکِ روزِ جزا تم کو سوا خوش رکھے

(۲۰۱۱)

لُٹا ہے میرا خزانہ مرے برابر سے
بدل گیا وہ ٹھکانہ مرے برابر سے

جو تِیر میرا نہیں تھا اُسی کا مجرم ہوں
لیا گیا تھا نشانہ مرے برابر سے

پلٹ کے کر گیا تلقین مجھ کو رُکنے کی
ہوا ہے جو بھی روانہ مرے برابر سے

بڑھا گیا مرا احساسِ عمرِ رفتہ کچھ اور
گزر کے یار پرانا مرے برابر سے

تمھی سے باقی ہے کچھ اعتبارِ بزمِ حیات
کبھی تم اُٹھ کے نہ جانا مرے برابر سے

(مارچ۲۰۱۱)

ویسے میں ہر حلیف سے محروم تو ہوا
کس کس کی زد پہ ہوں مجھے معلوم تو ہوا

کھوئے ہوئے کھلونے کی انتھک تلاش میں
دنیا سے آشنا کوئی معصوم تو ہوا

بکھرا ہوا تھا میرا فسانہ مری طرح
اشعار کے بہانے سے منظوم تو ہوا

لکھا گیا ہوں گرچہ خسارے کے باب میں
لیکن تری کتاب میں مرقوم تو ہوا

پھر سے ترے خیال کی اک روشنی ملی
زندہ ذرا سا خامۂ مرحوم تو ہوا

(۲۰۱۱)

دُعا

مری نظر میں تری آرزو نظر آئے
مجھے وہ آنکھ عطا کر کہ تو نظر آئے

کلام اپنا سمودے وجود میں ایسا
کہ میری چپ میں تری گفتگو نظر آئے

میں جب بھی آئنہ دیکھوں غرورِ ہستی کا
تو ایک عکسِ عدم روبرو نظر آئے

ہٹادے آنکھ سے میری یہ خواہشات کے رنگ
جو چیز جیسی ہے بس ہوبہو نظر آئے

ہجوم ِشہر تماشہ میں گم نہ ہو رستہ
نشانِ راہ ترا کوبکو نظر آئے

رواں دواں رہے جب تک مرا سفینۂ جاں
منارِ نور ہدیٰ چار سو نظر آئے

خلوصِ فکر عطا کر اور ایسا حسنِ عمل
کہ فکرِ دنیا تری جستجو نظر آئے

(دسمبر ۲۰۱۱)

دیدہ وروں سے کور نگاہی ملی مجھے
ایسے پڑھے ورق کہ سیاہی ملی مجھے

کس دشت میں چلا ہوں کہ احساس مر گیا
صورت دکھائی دی نہ صدا ہی ملی مجھے

خالی پیالے سینکڑوں ہاتھوں میں ہر طرف
تشنہ لبی اور ایک صراحی ملی مجھے

ہمزاد میرا مرگیا میری انا کے ساتھ
ورثے میں تختِ ذات کی شاہی ملی مجھے

اپنی نظر میں خود مری توقیر بڑھ گئی
جب سے تری نظر کی گواہی ملی مجھے

دیوارِ اختلاف سلامت ہے شہر میں
دونوں طرف ہی ورنہ تباہی ملی مجھے

چاروں طرف خزانے محبت کے ہیں ظہیرؔ
جو چیز میں نے پیار سے چاہی ، ملی مجھے

(۲۰۱۲)

سرحدِ شہرِ قناعت سے نکالے ہوئے لوگ
کیا بتائیں تمھیں کس کس کے حوالے ہوئے لوگ

اپنی قیمت پہ خود اک روز پشیماں ہونگے
سکۂ وقت کی ٹکسال میں ڈھالے ہوئے لوگ

آئنوں سے بھی نہ پہچانے گئے کچھ چہرے
آتشِ زر میں جلے ایسے کہ کالے ہوئے لوگ

کب سے ہے میرے تعاقب میں دہن کھولے ہوئے
ایک عفریتِ شکم جس کے نوالے ہوئے لوگ

تم سے بچھڑے ہیں تو ہر موڑ پہ ٹکراتے ہیں
سنگِ دشنام کے مانند اُچھالے ہوئے لوگ

راحتِ سایہ میں بیٹھیں گے تو بجھ جائیں گے
ہم کڑی دھوپ میں سورج کے اُجالے ہوئے لوگ

اے مرے شہرِ تمنا تری سرحد سے پرے
جی رہے ہیں تری نسبت کو سنبھالے ہوئے لوگ

(مارچ ۲۰۱۲)

پگھل کر روشنی میں ڈھل رہوں گا
نظر آکر بھی میں اوجھل رہوں گا

بچھڑ جاؤں گا اک دن اشک بن کر
تمہاری آنکھ میں دو پل رہوں گا

ہزاروں شکلیں مجھ میں دیکھنا تم
سروں پر بن کے میں بادل رہوں گا

میں مٹی ہوں ، کوئی سونا نہیں ہوں
جہاں کل تھا ، وہیں میں کل رہوں گا

بدن صحرا ہے لیکن آنکھ نم ہے
اِسی شبنم سے میں جل تھل رہوں گا

جہاں چاہو مجھے رکھ دو اٹھا کر
چراغِ نیم شب ہوں جل رہوں گا

گرا کر خود کو ہلکا ہو تو جاؤں
پر اندر سے بہت بوجھل رہوں گا

(مارچ ۲۰۱۲)

آئینہ گر کے دُکھ

پتھر ہی رہو ، شیشہ نہ بنو
شیشوں کی ابھی رُت آئی نہیں
اِس شہر میں خالی چہروں پر
آنکھیں تو اُبھر آئی ہیں مگر
آنکھوں میں ابھی بینائی نہیں
خاموش رہو ، آواز نہ دو
کانوں میں سماعت سوتی ہے
سوچوں کو ابھی الفاظ نہ دو
احساس کو زحمت ہوتی ہے
اظہارِ حقیقت کے لہجے
سننے کا ابھی دستور نہیں
الفاظ و معانی کے رشتے
ذہنوں کو ابھی منظور نہیں
یہ شہر کسی کا شہر ہے کب
یہ لوگ نہیں ہیں سائے ہیں
اِن سایوں میں کوئی مہر ہے کب

یہ پیاس بڑھانے آئے ہیں
اشکوں سے کہو جم جائیں وہیں
جس چشمۂ غم سے پھوٹے ہیں
آہوں سے کہو تھم جائیں وہیں
یہ جذبے شاید جھوٹے ہیں
مت ہاتھ بڑھاؤ چاہت کا
انجان بنو ، انجان رہو
یہ رسم گراں ہے لوگوں پر
مشکل نہ بنو ، آسان رہو
جو بھول چکے ہو مدت سے
اُس درد کو پھر آغاز نہ دو
جانے دو انہیں ، آواز نہ دو
آواز نہ دو ، آواز نہ دو

(۲۰۱۲)

(نوجوان دوستوں خصوصًا نئے قلم کاروں کے لئے)

شعاعِ نورِ حرم ہے نئے چراغوں میں
خدا کا عکسِ کرم ہے نئے چراغوں میں

یہ سلسلہ ہے وہی لو سے لو جلانے کا
بجھے ہوؤں کا جنم ہے نئے چراغوں میں

کمی جو اِن کے اُجالے میں ہے ، ہماری ہے
لہو ہمارا بہم ہے نئے چراغوں میں

بجائے طاقِ شبستاں جلے ہیں رستوں پر
اندھیری راہ کا غم ہے نئے چراغوں میں

مآلِ ہستیِ یک شب سے ہو گئے واقف
ہوا کا خوف عدم ہے نئے چراغوں میں

لکھے ہیں شب زدہ آنکھوں میں جتنے اندیشے
جواب اُن کا رقم ہے نئے چراغوں میں

طلوعِ صبحِ منوّر کا ایک زندہ یقین
زوالِ شب کی قسم! ہے نئے چراغوں میں

(۲۰۱۲)

عجیب قاعدے ہجرت! تری کتاب میں ہیں
خسارے دونوں طرف کے مرے حساب میں ہیں

یہ طے ہوا ہے کہ اب اُس کی ملکیت ہونگے
وہ سب علاقے جو میری حدودِ خواب میں ہیں

نہ تشنگی میں کمی ہے ، نہ پانیوں کی کمی
عذاب میں ہیں کہ پیاسے کسی سراب میں ہیں

تجھے ہی رکھتے ہیں قلب و نظر کے آگے امام
جہاں بھی ہوں ترے بندے تری جناب میں ہیں

اُبھر کے بحرِ کشاکش سے دیکھتے ہیں تجھے
ذرا سی دیر کو ہم گنبدِ حباب میں ہیں

(۲۰۱۲)

اپنے پندار کا در توڑ دیا میں نے بھی
بے لباس اپنا بدن دیکھ لیا میں نے بھی

بے حسی کا کوئی مشروب تھا سب ہاتھوں میں
زہر سمجھو کہ دوا پی ہی لیا میں نے بھی

آدمی تھا میں فرشتہ تو نہیں تھا آخر
جس طرح جیتے ہیں دنیا میں جیا میں نے بھی

کر تے جاتے تھے سبھی کشتِ تمنا سیراب
اپنی خواہش کو لہو دے ہی دیا میں نے بھی

بیٹھ کر سوزن ِتدبیر سے اوروں کی طرح
اپنا پیراہنِ صد چاک سیا میں نے بھی

(اپریل ۲۰۱۲)

یہ مرا غم کسی صورت نہیں گھٹنے والا
ناخدا تھا مری کشتی کو اُلٹنے والا

لذتِ درد کا موسم بھی کبھی بدلا ہے؟
ابرِ غم سر سے یہ برسوں نہیں چھَٹنے والا

چھوڑ کر دیکھ تو احساس کا دامن اے دل
غم رہے گا نہ کوئی جاں سے لپٹنے والا

راہِ تسکین پہ لے آئی تمنا مجھ کو
زندگی بھر بھی سفر اب نہیں کٹنے والا

مانتا ہوں کہ نظر مجھ کو ملی ہے لیکن
کوئی منظر بھی تو ہو دل میں سمٹنے والا

حرمتِ حرفِ یقیں دل پر اُتاری جائے
میں کوئی نام زبانی نہیں رَٹنے والا

ملک الموت اٹھائے تو اٹھائے آکر
میں ترے در سے ہٹائے نہیں ہٹنے والا

(۲۰۱۲)

ہوش و خرد ، غرورِ تمنا گنوا کے ہم
پہنچے ترے حضور میں کیا کیا لٹا کے ہم

کوہِ گرانِ عشق تری رفعتوں کی خیر!
دامن میں تیرے آگئے تیشہ گنوا کے ہم

ہم پیش کیا کریں اُسے کشکول کے سوا
وہ ذات بے نیاز ہے ، بھوکے سدا کے ہم

نادم ہیں کر کے چہرۂ قرطاس کو سیاہ
ناموسِ حرف اوجِ قلم سے گرا کے ہم

ہم لوگ ہیں ظہیرؔ اُسی اک خیال کے
نکلے نہ جس خیال سے اک بار جا کے ہم

(۲۰۱۲)

موجِ شرابِ عشق پہ ڈولے ہوئے سخن
اک عالمِ نشاط میں بولے ہوئے سخن

جیسے اتر رہے ہوں دلِ تشنہ کام پر
تسنیم و زنجبیل میں گھولے ہوئے سخن

جیسے پروئیں تارِ شنیدن میں درِّ ناب
لب ہائے لعل گوں سے وہ رولے ہوئے سخن

آؤ سناؤں محفلِ شیریں سخن کی بات
برہم ہوئے مزاج تو شعلے ہوئے سخن

ہوتے نہیں ظہیرؔ کبھی ترجمانِ دل
میزانِ احتیاط میں تولے ہوئے سخن

(۲۰۱۲)

کب سے لگی ہے اُس کی نشانی کتاب میں
کاغذ مڑا ہوا ہے پرانی کتاب میں

خلقِ خدا میں ٹھہری وہی سب سے معتبر
لکھی نہ جا سکی جو کہانی کتاب میں

طاقت ہے کس قلم میں کہ لکھے حدیثِ عشق
ملتی ہے یہ کسی سے زبانی کتاب میں

اربابِ جہل کرنے لگے شرحِ حرفِ عشق
مت کیجئے تلاش معانی کتاب میں

منشورِ حق کے ہوتے مجھے کیا غرض بھلا
لکھا ہے کیا فلاں نے فلانی کتاب میں

کیسے اٹھے گی دستِ سہولت شعار سے
ناموسِ حرف کی ہے گرانی کتاب میں

کاغذ خراب حال ، عبارت اڑی ہوئی!
دیکھو مری شکستہ بیانی کتاب میں

فیضِ قلم سے آگئی مجھ کو بھی اب ظہیرؔ
اشکوں کی آبشار بنانی کتاب میں

(۲۰۱۲)

راہبر دیکھ لئے ، راہ گزر دیکھ آئے
بیچ رستے سے ہم انجامِ سفر دیکھ آئے

عارضے اتنے نہیں جتنے مسیحا ہیں نصیب
غمگسار اپنی دعاؤں کا اثر دیکھ آئے

دیکھنے جس کو گئے تھے وہی بستی نہ ملی
یاد کے اجڑے ہوئے چند کھنڈر دیکھ آئے

نہ وہ منظر رہے باقی ، نہ وہ آنکھیں ہی رہیں
شہرِ رفتہ کو بہ اندازِ دگر دیکھ آئے

اُس گلی میں بھی ہوا جانا جدھر جنت تھی
ہم سے دیکھا ہی نہ جاتا تھا مگر دیکھ آئے

ڈگمگائے تھے جہاں ہوش کے مدہوش قدم
ہجر پہلو میں لئے پھر وہ ڈگر دیکھ آئے

محفلِ غیر بھی اُجڑی ہوئی دیکھی اِس بار
بزمِ یاراں کو بھی ہم زیر و زبر دیکھ آئے

رشکِ افلاک ہیں وہ لوگ کہ جب دل چاہا
تری دہلیز پہ پہنچے ، ترا در دیکھ آئے

ہم کھڑے تکتے ہیں قسمت کے ستاروں کو ظہیرؔ
دیکھنے والے تو مریخ و قمر دیکھ آئے

(پاکستان سے واپسی پر۔ ۲۰۱۲)

اہلِ دل چشمِ گہر بار سے پہچانے گئے
دیدہ ور تیرے ہی دیدار سے پہچانے گئے

ہم نے کب دعویٰ زمانے میں کیا الفت کا
ہم تو چپ تھے ، ترے انکار سے پہچانے گئے

خود کو آزاد سمجھتے تھے مگر وقتِ سفر
ایک زنجیر کی جھنکار سے پہچانے گئے

معرکے جو بھی سمندر سے ہوئے ساحل تک
میری ٹوٹی ہوئی پتوار سے پہچانے گئے

دشمنی میں نے اصولوں کی بنا پر رکھی
میرے دشمن میرے کردار سے پہچانے گئے

آگیا دست ِصحافت میں عدالت کا قلم
جھوٹ اور سچ بھی اب اخبار سے پہچانے گئے

آج کے دورِ ضرورت میں مشینوں کی طرح
آدمی کام کی رفتار سے پہچانے گئے

(اپریل ۲۰۱۲)

اپنوں نے بھی منّت کی ، غیروں نے بھی سمجھایا
کرنا تھا جو اِس دل نے کیا ، باز نہیں آیا

نالہ کبھی کھینچا ہے ، تو گیت کبھی گایا
نازِ شبِ ہجراں تو کسی طور نہ اُٹھ پایا

دیکھا تھا کبھی جس کی گلیوں میں اُسے دل نے
چلتے ہی رہے ہم تو وہ شہر نہیں آیا

آوارگی میری ہے ، رستے کے مقدر میں
اور میرے مقدر میں ہر منزلِ بے سایا

غزلوں میں فسانوں میں کس شخص کی باتیں ہیں؟
ہم نے تو بہت ڈھونڈا ، دیکھا نہ کہیں پایا

جب یاد کوئی آئی ، ہم روئے اکیلے میں
جب روئے اکیلے میں ، تو یاد کوئی آیا

(مئی ۲۰۱۲)

ناخداؤں کے کھُلے کیسے بھرم پانی میں
کیا سفینے تھے کئے غرق جو کم پانی میں

شہر کا شہر ہوا گریہ کناں مثلِ سحاب
کون دیکھے گا کوئی دیدۂ نم پانی میں

ڈر نہیں سیلِ زمانہ سے کہ ہم سوختہ جاں
سنگِ جاوا ہیں ، نہیں ڈوبتے ہم پانی میں

چھین لے مجھ سے مری خشکیِ دامن کا غرور
جوشِ گریہ! ابھی اتنا نہیں دم پانی میں

اشک ہے سوزِ دروں ، اشک غبارِ خاطر!
آتش و خاک بالآخر ہوئے ضم پانی میں

یونہی بھر آئے کبھی آنکھ تو ہوتی ہے غزل
آ ہوئے حرفِ سخن کرتا ہے رم پانی میں

قطرۂ اشک ہو یا جرعۂ صہبا ہو ظہیرؔ
ہم ڈبوتے نہیں اپنا کوئی غم پانی میں

(۲۰۱۲)

دوائیں رکھتے ہوئے ، نشتروں کے ہوتے ہوئے
مرض تو بڑھ گئے چارہ گروں کے ہوتے ہوئے

حریفِ جاں! یہ روایت نہیں ہماری کہ ہم
عمامے پیروں میں رکھ دیں سروں کے ہوتے ہوئے

ثبوت اور میں کیا دوں تجھے اسیری کا
اُڑانیں دیکھ تو میری پروں کے ہوتے ہوئے

ہر آدمی ہے تلاشِ اماں میں سرگرداں
تمام شہر ہے بے گھر گھروں کے ہوتے ہوئے

یہ سوچنے کی نہیں فیصلے کی ساعت ہے
گزر نہ جائے کہیں مشوروں کے ہوتے ہوئے

یہ فاصلے تو بڑھے جارہے ہیں روز بروز
تمام ہاتھوں میں نامہ بروں کے ہوتے ہوئے

تم اُن کی گرد میں منزل کو ڈھونڈتے ہو ظہیرؔ
جو کارواں ہوئے گم رہبروں کے ہوتے ہوئے

(۲۰۱۳)

ہم خاک نشینوں کو نئی خاک ملی ہے
جو چھوڑ کر آئے وہی املاک ملی ہے

ہم سادہ روش لوگ بدلتے نہیں چولے
میلی ہی نہیں ہوتی وہ پوشاک ملی ہے

پہنے ہوئے پھرتے ہیں تہِ جبہ و دستار
در سے جو ترے خلعتِ صد چاک ملی ہے

رکھی ہے بصارت کی طرح دیدۂ تر میں
قسمت سے ہمیں نعمتِ نمناک ملی ہے

سونے کے بدل بکتی ہے بازار میں خوشبو
پھولوں کو مگر قیمتِ خاشاک ملی ہے

رکھتے ہیں امانت کی طرح نقدیِ جاں کو
وہ لوگ جنہیں دولتِ ادراک ملی ہے

دیتے ہوئے ڈرتا ہوں اُسے جامۂ الفاظ
خامے کو طبیعت مرے بے باک ملی ہے

دریا کے کنارے بھی کہیں ملتے ہیں لوگو؟
دھرتی سے کہیں سرحدِ افلاک ملی ہے؟

(مئی ۲۰۱۳)

پندار کی ویران سرا میں نہیں رہتے
ہم خاک پہ رہتے ہیں خلا میں نہیں رہتے

قامت بھی ہماری ہے ، لبادہ بھی ہمارا
مانگی ہوئی دستار و قبا میں نہیں رہتے

ہم کشمکشِ دہر کے پالے ہوئے انسان
ہم گریہ کناں کرب و بلا میں نہیں رہتے

خاشاکِ زمانہ ہیں ، نہیں خوف ہمیں کوئی
آندھی سے ڈریں وہ جو ہوا میں نہیں رہتے

ہم چھوڑ بھی دیتے ہیں کُھلا توسنِ دل کو
تھامے ہوئے ہر وقت لگامیں نہیں رہتے

روحوں میں اتر جاتے ہیں تیزاب کی صورت
لفظوں میں گھلے زہر صدا میں نہیں رہتے

احساس کے موسم کبھی ہو جائیں جو بے رنگ
خوشبو کے ہنر دستِ صبا میں نہیں رہتے

اونچا نہ اُڑو اپنی ضرورت سے زیادہ
تھک جائیں پرندے تو فضا میں نہیں رہتے

دستار بنے جاتے ہیں اب شہرِ طلب میں
کشکول کہ اب دستِ گدا میں نہیں رہتے

اس خانہ بدوشی میں خدا لائے نہ وہ دن
جب بچھڑے ہوئے یار دعا میں نہیں رہتے

(۲۰۱۳)

ہر روز تازہ حادثہ جب ہو گیا کہیں
تھک ہار کر ضمیر مرا سو گیا کہیں

کھولی تھی جس میں آنکھ جوانی کے خواب نے
وہ رَت جگوں کا شہر مرا کھو گیا کہیں

کچھ دیر کو ملے تھے سرِ راہِ احتیاج
پھر یوں ہوا کہ میں کہیں ، اور وہ گیا کہیں

اُگتی ہے کشتِ ذات میں مایوسیوں کی پود
کچھ خواہشوں کے بیج کوئی بو گیا کہیں

(۲۰۱۳)

البم سے کئی عکس پرانے نکل آئے
لمحات کے پیکر میں زمانے نکل آئے

بھولے ہوئے کچھ نامے ، بھلائے ہوئے کچھ نام
کاغذ کے پلندوں سے خزانے نکل آئے

تھے گوشہ نشیں آنکھ میں آنسو مرے کب سے
عید آئی تو تہوار منانے نکل آئے

حیرت سے سنا کرتے تھے غیروں کے سمجھ کر
خود اپنے ہی لوگوں کے فسانے نکل آئے

پتھریلی زمینیں تھیں ، مگر حوصلہ سچا
ہم تیشہ لئے پیاس بجھانے نکل آئے

اک ناوکِ بے نام تھا ہر روز عقب سے
ہم باندھ کے سینوں پہ نشانے نکل آئے

گھر سے نہ نکلنا بھی روایت تھی ہماری
بس اپنی روایات بچانے نکل آئے

(۲۰۱۳)

جنگ اندھیرے سے بادِ برہم تک
ہے چراغوں کی آخری دم تک

آدمی پر نجانے کیا گزری
ابنِ آدم سے ابنِ درہم تک

تم مسیحا کی بات کرتے ہو؟
ابھی خالص نہیں ہے مرہم تک!

معجزہ دیکھئے توکّل کا!
ریگِ صحرا سے آبِ زمزم تک

داستاں ہے شگفتنِ دل کی
خندۂ گل سے اشکِ شبنم تک

اک سفر ہے کہ طے نہیں ہوتا
سرخ ہجرت سے سبز پرچم تک

فاصلے کیسے ، دوریاں کیسی؟
جن کو ملنا تھا آ گئے ہم تک

پیار دھرتی پہ ہے خلا میں نہیں
آسماں کو ظہیرؔ کم کم تک

(جون ۲۰۱۳)

کچھ دیر کو رسوائیِ جذبات تو ہوگی
محفل میں سہی اُن سے ملاقات تو ہوگی

بس میں نہیں اک دستِ پذیرائی گر اُس کے
آنکھوں میں شناسائی کی سوغات تو ہوگی

سوچا بھی نہ تھا خود کو تمہیں دے نہ سکوں گا
سمجھا تھا مرے بس میں مری ذات تو ہوگی

ہر حال میں ہنسنے کا ہنر پاس تھا جن کے
وہ رونے لگے ہیں تو کوئی بات تو ہوگی

میں پوچھ ہی لوں گا کہ ملا کیا تمہیں کھو کر
اک روز کہیں خود سے مری بات تو ہوگی

اِس بازیِ مابینِ غمِ وصلت و ہجراں
جس مات سے ڈرتے ہو وہی مات تو ہوگی

اِس آس پہ دن شہرِ ضرورت کو دیا ہے
اُجرت میں ترے ساتھ مری رات تو ہوگی

ہو جاؤں خفا میں تو منانے کوئی آئے
اے دوستو اتنی مری اوقات تو ہوگی

(۲۰۱۳)

قطعہ

ہر لمحہ زہرِ نو کوئی پی کر دکھائے تو
مر مر کے شہرِ ہجر میں جی کر دکھائے تو
اپنے ہی ہاتھوں اپنا کلیجہ کیا ہے چاک
چارہ گری کرے ، کوئی سی کر دکھائے تو

(نومبر۲۰۱۳)

تاریک دیاروں میں اُجالے کا پتہ ہیں
ہم لوگ محبت ہیں ، مروت کی ادا ہیں

مِٹتا ہوا اک نقش ہیں ہم لوحِ جہاں پر
بجھتے ہوئے خاموش ستاروں کی ضیا ہیں

ہم دستِ محبت میں علمدارِ مساوات!
ہم دُور سے آتی ہوئی مانوس صدا ہیں

ہم نطقِ محبت میں ہیں الفاظِ پذیرائی!
ہم چشمِ اخوت میں عنایت کی نگاہیں!

ہر اک کو لگاتے ہیں گلے نام پر اُس کے
سینہ بھی کشادہ ہے تو بازو بھی یہ وا ہیں

خوشبو کی طرح پھیلے ہیں ہم راہ گزر پر
تاریکیِ شب تار میں جگنو کی ضیا ہیں

تاراجِ محبت ہیں اٹھائے ہوئے کشکول
آوارۂ دنیا نہیں ، الفت کے گدا ہیں

جھُلسے ہوئے منظر میں ہیں سائے کی نشانی
گرتی ہوئی دیوارِ روایت کا پتہ ہیں

ہم کفر سمجھتے ہیں حقارت کی نظر کو
نفرت کی زمینوں میں عنایت کی فضا ہیں

کھُل جائے گا اک بابِ اثر دل میں تمہارے
مانگو تو سہی ہم کو ہمی حرفِ دعا ہیں

بجھتے ہیں گھڑی بھر کو جل اُٹھنے کیلئے پھر
ہم لوگ ہواؤں کے نشیمن میں دیا ہیں

آجائے نہ تیشے میں کہیں ضربتِ ایمان
اِس خوف میں اب امّتِ آزر کے خدا ہیں

(۲۰۱۳)

آسرے توڑتے ہیں ، کتنے بھرم توڑتے ہیں
حادثے دل پہ مرے دُہرا ستم توڑتے ہیں

آستینوں میں خداوند چھپا کر اتنے
لوگ کن ہاتھوں سے پتھر کے صنم توڑتے ہیں

اُٹھ گئی رسمِ صدا شہر طلب سے کب کی
اب تو کشکولِ ہوس بابِ کرم توڑتے ہیں

جھوٹی تعبیر کے آرام کدے سے تو نکل
خواب کتنے تری دہلیز پہ دم توڑتے ہیں

ہم نے اُس شہر میں بھی پاسِ وفا رکھا ہے
قیس و فرہاد جہاں روز قسم توڑتے ہیں

پڑھنے والے پڑھا کرتے ہیں ترے چہرے کو
لکھنے والے ترے قدموں میں قلم توڑتے ہیں

تیرا اعجاز کہ ہم تیری اسیری کے لئے
دامِ صد حلقۂ دینار و درم توڑتے ہیں

(۲۰۱۴)

قتیلِ درد ہوا میں تو غمگسار آئے
رہی نہ جان سلامت تو جاں نثار آئے

تمہارا غم تھا میسر تو کوئی روگ نہ تھا
چلا گیا وہ مسیحا تو غم ہزار آئے

قبائے کذب و ریا اور کلاہِ نام و نمود
کہیں اُترنے سے پہلے ہی ہم اتار آئے

ہوئی نہ جراتِ طوفِ حریمِ عشق ہمیں
بس ایک سنگِ ملامت انا کو مار آئے

اک عرضِ شوق بصد حسرتِ دلِ ناکام
حضورِ ناز میں پہنچے تو پھر گزار آئے

متاعِ فکر و نظر ، ثروتِ خیال و خواب
خزانے جتنے میسر تھے اُن پہ وار آئے

ہزار اشکِ محبت بہم ہیں آنکھوں میں
کہاں سے شیشۂ دل پر کوئی غبار آئے

وصالِ یار حقیقت ہے گر تو ختم نہ ہو
اگر یہ خواب ہے کوئی تو بار بار آئے

ذرا سی دولتِ دل تھی ظہیرؔ اُسکو بھی
قمارخانۂ الفت میں جا کے ہار آئے

(اگست ۲۰۱۴)

قرآن کہا جائے نہ تفسیر کہا جائے
ہر فتوئِ تکفیر کو تقصیر کہا جائے

کس حرفِ طرح دار پہ انگشتِ یقیں رکھیں
کس عکس کو سچائی کی تصویر کہا جائے

کس دستِ مسیحائی پہ بیمار کریں بیعت
جب زہرِ ہلاہل کو بھی اکسیر کہا جائے

معیار بدلتے ہوئے اس دور میں ممکن ہے
اک روز اندھیرے کو بھی تنویر کہا جائے

آداب کو اب فہرسِ بیکار میں لکھ ڈالو
اقدار کو اب پاؤں کی زنجیر کہا جائے

بینائی جنہیں ملتی ہے ہو جاتے ہیں دیوانے
آنکھوں کو مرے عہد میں تعزیر کہا جائے

اشکوں کو ترے نامۂ اعمال میں لکھوں میں
یا ان کو کسی خواب کی تعبیر کہا جائے

ہجرت ہو کہ ہجراں ہو ، غمِ جاں کہ غمِ جاناں
ہر درد کو اُس نام کی جاگیر کہا جائے

(۲۰۱۴)

حسرتیں چھوڑ گئیں کوچۂ و بازار کے بیچ
لوگ ٹوٹے ہوئے ، سالم در و دیوار کے بیچ

زینتِ صفحۂ اول ہے تماشائے حیات
آدمی چھوٹی خبر ہے کہیں اخبار کے بیچ

بیش و کم کیا کریں اب ، دام جو لگتے ہیں لگیں
نقدِ جاں رکھ چکے ہم درہم و دینار کے بیچ

نخلِ اندیشۂ صد شاخِ زیاں اگتا ہے
ہر گلستانِ شجر دار و ثمربار کے بیچ

موجۂ بادِ صبا زلف سے اُن کی نہ الجھ
گُل نہیں دل ہے مرا گیسوئے خمدار کے بیچ

مل گیا مجھ کو مرے سارے سوالوں کا جواب
اک توقف تھا ترے کلمۂ ا نکار کے بیچ

تمھیں مل جائے گی پہچان مرے لفظوں سے
کبھی پڑھ کر مجھے دیکھو مرے اشعار کے بیچ

میں سمجھتا نہیں دریا کو کنارے سے الگ
وہ شناور ہوں کہ رہتا ہے جو منجدھار کے بیچ

جو ملا شاخِ محبت سے اُسے چوم لیا
فرق رکھا ہی نہیں ہم نے گل و خار کے بیچ

یادِ یارانِ وطن اور کبھی ذکرِ وطن!
یہ دوائیں ہیں مری مجمعِ آزار کے بیچ

ہمیں مرنا بھی ہے اپنی ہی روایات پر آج
اور جینا بھی ہے مرتی ہوئی اقدار کے بیچ

اک تنازع ہے ہنر عہدِ ضرورت میں ظہیرؔ
کاسۂ دادِ فن و کیسۂ فنکار کے بیچ

(۲۰۱۴)

وہ ایک شخص کہ سب جا چکے تو یاد آیا
کسی کو آئے نہ آئے مجھے تو یاد آیا

مقابلے پر اندھیرا نہیں ہوا بھی ہے
کئی چراغ یکایک بجھے تو یاد آیا

ہمارے ساتھ بھی موسم نے داؤ کھیلا تھا
خزاں کے ہاتھ سے پتے گرے تو یاد آیا

گئی رتوں کے پرندے ابھی نہیں لوٹے
شجر پہ تازہ شگوفے کھلے تو یاد آیا

کسی کی ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کا قرض مجھے
گلاب شاخ سے کانٹے چبھے تو یاد آیا

بہت زمانے سے کاغذ پہ دل نہیں رکھا
پرانے بیگ سے کچھ خط ملے تو یاد آیا

وہ ایک رسم تھی بڑھ کر گلے لگانے کی
تمام ہوچکے شکوے گلے تو یاد آیا

قدم قدم پہ وہ گزرا ہوا زمانہ ظہیرؔ
کسی کو آئے نہ آئے مجھے تو یاد آیا

(۲۰۱۴)

راز در پردۂ دستار و قبا جانتی ہے
کون کس بھیس میں ہے خلقِ خدا جانتی ہے

کون سے دیپ نمائش کے لئے چھوڑنے ہیں
کن چراغوں کو بجھانا ہے ہوا جانتی ہے

اک مری چشمِ تماشہ ہے کہ ہوتی نہیں سیر
فکرِ منزل ہے کہ رُکنے کو برا جانتی ہے

نشۂ عشق مجھے اور ذرا کر مدہوش
بے خودی میری ابھی میرا پتہ جانتی ہے

یہ کبھی مجھ کو اکیلا نہیں ہونے دیتی
میری تنہائی مجھے تم سے سوا جانتی ہے

آپ ایجاد کریں جور و ستم روز نئے
بھول جانے کا ہنر میری وفا جانتی ہے

دشت منظور ہے لیکن مجھے منظور نہیں
ایسی بستی جو شرافت کو خطا جانتی ہے

کون سے بُت ہیں جنہیں دستِ پیمبر توڑے
اُمّتِ حرص تو پیسے کو خدا جانتی ہے

نسبتیں لاکھ بدل ڈالے زمانہ لیکن
ایک دنیا تو مجھے اب بھی ترا جانتی ہے

اور کیا دیتی محبت کے سوا ارضِ وطن
ماں تو بیٹوں کے لئے صرف دعا جانتی ہے

میرے الفاظ ہیں دراصل قلم کے آنسو
روشنائی لہو بننے کی ادا جانتی ہے

(۲۰۱۴)

دونوں سرے ہی کھوگئے ، بس یہ سرا ملا
اپنی خبر ملی ہے نہ اُس کا پتہ ملا

رو رو کے مٹ گیا ہوں تو مجھ پر نظر ہوئی
بینائی کھو گئی تو مجھے آئنہ ملا

اُس کو کمالِ ضبط ملا ، مجھ کو دشتِ ہجر
لیکن سوال یہ ہے کہ دنیا کو کیا ملا

آنے لگے نظر غم و آلامِ دو جہاں
بالغ نظر ہوئے تو اِن آنکھوں کو کیا ملا

گم دشتِ شوق میں جو ہوئے ، پا گئے مراد
منزل نہ پاسکے وہ جنہیں رہنما ملا

مخلوق ہوں میں اُس کی مرا ہاتھ تھام لیں
دیکھیں مجھے بھی کاش وہ جن کو خدا ملا

دیکھا نکل کے خود سے تو منظر کھلا ظہیرؔ
ہمت بڑھی ہے میری ، مجھے حوصلہ ملا

اس شہرِ شب زدہ میں کہ جنگل سے کم نہیں
جگنو شعورِ ذات کا مشعل سے کم نہیں

اک مختصر سا لمحۂ بے نور و بے یقین
تقویمِ شب میں ساعتِ فیصل سے کم نہیں

اک یادِ مشکبو تری زلفِ سیاہ کی
چشمِ شبِ فراق میں کاجل سے کم نہیں

دامانِ احتیاج میں دینارِ بے کسب
جوفِ شکم میں تیغِ مصقّل سے کم نہیں

حاصل ہے سخت کوشیِ عمرِ خراب کا
اک خطۂ زمین جو دلدل سے کم نہیں

بنجر زمین ، دھوپ اور اک خالی آسمان!
سایہ کسی پرند کا بادل سے کم نہیں

سیالِ غم بھی ڈھونڈ کے تم نے پیا ظہیرؔ
تریاق جس کا زہر کی بوتل سے کم نہیں

(۲۰۱۴)

کیا سخن تھے کہ جو دل میں بھی چھپائے نہ گئے
لبِ اظہار تک آئے پہ سُنائے نہ گئے

ضعفِ مضرابِ تمنا کوئی دیکھے تو مرا
تار بھی بربطِ ہستی کے ہلائے نہ گئے

دل تو کافر ہی رہا توڑ کے بت خانہ بھی
بت کچھ ایسے تھے کہ نظروں سے گرائے نہ گئے

چشمِ نم بھول گئے ، عارضِ تر بھول گئے
یہ الگ بات وہ آنسو ہی بھُلائے نہ گئے

میرے زخموں کا بھی درمان تو ممکن تھا مگر
زخم ایسے تھے مسیحا کو دکھائے نہ گئے

بارِ نفرت لئے پھرتی ہے یہ دنیا کیسے!
ہم سے آزارِ محبت ہی اُٹھائے نہ گئے

دل کی دنیا پہ حکومت تو ملی تھی کچھ روز
چام کے دام مگر ہم سے چلائے نہ گئے

ہم وہ نادارِ محبت ہیں کہ ہنگامِ وداع
گوہرِ اشک بھی پلکوں پہ سجائے نہ گئے

ہم دوانوں سے خفا کیوں ہوئے اربابِ خرد
اُن کی دہلیز پہ ہم تو کبھی آئے نہ گئے

ہم نفس رات کے پھونکوں سے بجھا دیتے ہیں
جو دیئے تیز ہواؤں سے بجھائے نہ گئے

(۲۰۱۴)

مشعلِ حرف لئے نور بکف ہو جائیں
کاش ہم اپنے زمانے کا شرف ہو جائیں

عقل کہتی ہے چلو ساتھ زمانے کے چلیں
ظرف کہتا ہے کہ ہم ایک طرف ہو جائیں

دل یہ کہتا ہے ترا نام اُتاریں دل میں
اور کسی گہرے سمندر میں صدف ہو جائیں

حیف وہ جنگ کہ دونوں ہی طرف ہوں اپنے
ہائے وہ لوگ جو خود اپنا ہدف ہو جائیں

کشتیاں اپنی جلائی ہیں عدو نے اِس بار
اب تو لازم ہے کہ ہم جان بکف ہو جائیں

معرکہ کوئی بھی مشکل تو نہیں ، اہلِ حرم
توڑ کر دائرے گر شاملِ صف ہو جائیں

ڈر رہا ہوں کہ یہ اوراقِ شب و روز مرے
یوں نہ ہو عہدِ ضرورت میں تلف ہو جائیں

کون زحمت کرے پھر شمعیں جلانے کی ظہیرؔ
جب سیہ رات کے شکوے ہی شغف ہو جائیں

(۲۰۱۴)

اپنی متاعِ خواب مرے نام کرگیا
اک شخص شہرِ ہجر میں گمنام مرگیا

ترکِ جنون کرکے بیاباں سے گھر گیا
بازی نبردِ عشق کی دیوانہ ہر گیا

اِس رقصِ گردبادِ غمِ روزگار میں
ہر جامۂ لحاظ بدن سے اتر گیا

سورج کو سر پہ لاد کے دن بھر چلا تھا میں
اُس کو فصیلِ شام پہ چھوڑا تو گھر گیا

شاخِ گلاب شعلۂ لرزاں لگی مجھے
پروردۂ خزاں تھا بہاروں سے ڈر گیا

اک حرفِ بے شرف کہ کوئی بولتا نہ تھا
بولا گیا تو شہر صداؤں سے بھر گیا

ہر جوہرِ حیات ہوا صرفِ اندمال
اک زخم بھرتے بھرتے مرا کام کر گیا

قدموں سے راستے گئے رہبر کی آس میں
رہبر ملے تو ہاتھ سے رختِ سفر گیا

جرمِ وفائے یار کے مجرم بھی ہم ہوئے
الزامِ خود سری بھی ہمارے ہی سر گیا

در پر ترے جھکے تو زمانہ ہوا خلاف
چھوٹا سا ایک کام بڑا نام کر گیا

پھر سے زمین ہے کسی وارث کی منتظر
گرد و غبارِ وقت میں آدم بکھر گیا

ایسے ملے سرابِ مسلسل کہ اب ظہیرؔ
تشنہ لبی تو ہے مگر احساس مر گیا

(۲۰۱۴)

اٹھاؤں کیسے میں بارِ گرانِ سجدۂ شوق
کہاں زمین ، کہاں آسمانِ سجدۂ شوق

نبردِ عشقِ بلا کش کہاں ہوئی ہے تمام
ابھی تو دور ہے سر سے امانِ سجدۂ شوق

زمانے بھر کو مسلسل فرازِ نیزہ سے
سنا رہا ہے کوئی داستانِ سجدۂ شوق

حقیقت اس کی مری حسرتِ نیاز سے پوچھ
زمانے بھر کو ہے جس پر گمانِ سجدۂ شوق

وہ سنگِ در تو کجا ، اُس کی رہگزر دیکھو
قدم قدم پہ سجے ہیں نشانِ سجدۂ شوق

مزا تو تب ہے کہ کھوجائیں آستان و جبیں
بس ایک تو رہے باقی میانِ سجدۂ شوق

وہ روحِ بندگی جس کی تلاش میں ہے جبیں
ہے ماورائے زمین و زمانِ سجدۂ شوق

خدائے منبر و محراب! یہ دعا ہے مری
کہ لامکاں میں عطا ہو مکانِ سجدۂ شوق

ظہیرؔ کیجے وضو آبِ انفعال سے آپ
ہوئی ہے خلوتِ جاں میں اذانِ سجدۂ شوق

(اکتوبر۲۰۱۵)

ترکِ وطن

مرہموں کی صورت میں زہر بھی ملے ہم کو
نشتروں کے دھوکے میں وار بھی ہوئے اکثر
منزلوں کی لالچ میں راستے گنوا ڈالے
رہبروں کی چاہت میں خوار بھی ہوئے اکثر

ہر فریب ِتازہ کو مسکرا کے دیکھا تھا
دل کو عہدِ رفتہ کے طور ابھی نہیں بھولے
چشمِ خوش گما ں گرچہ تیرگی میں الجھی تھی
خواب دیکھنا لیکن ہم کبھی نہیں بھولے

چُور ہوگئے بازو اک نبردِ پیہم سے
دامنِ رواداری ہاتھ سے نہیں چھوڑا
اک بھرم رہا جب تک اِس سفید پوشی کا
درد کی امانت سے ہم نے منہ نہیں موڑا

سنگِ رہ گوارا تھے ، ہر سراب تھا منظور
رہزنوں سے تنگ آکر راستے بدل ڈالے
یوں نہیں کہ کھو بیٹھے ہم یقینِ منزل کو
بس وہاں رسائی کے واسطے بدل ڈالے

دشتِ ترکِ الفت سے ہجر نے پکارا تھا
ہم تمام زنجیریں توڑ کر چلے آئے
کاروبارِ نقدِ جاں ، داستانِ حسنِ و عشق
سب کو درمیاں میں ہم چھوڑ کر چلے آئے

کسبِ نانِ سادہ میں دن کو کرلیا مصروف
شام ہم نے کر ڈالی وقفِ یادِ دلداراں
دل کو رکھ دیا ہم نے رہنِ آشنا دشمن
دھڑکنیں کسے کرتے نذر بعدِ دلداراں

اک تضادِ جسم و جاں ہے دیارِ ہجرت میں
کوبکو ہیں سرگرداں ، موسموں کو گنتے ہیں
ہر نئے مسیحا سے باندھ کر امیدیں ہم
عہدِ زخم داری میں مرہموں کو گنتے ہیں

تہمتیں سہی ہم پر ہاں گریزپائی کی
سست گام ہیں مانا ، پر سفر تو جاری ہے
ہاں نہیں رہے شامل کارواں میں ہم ، لیکن
مرکزِ یقیں اب بھی آرزو ہماری ہے

دامنِ وفا گرچہ دھجیاں ہوا کب کا
جسم سے یہ پیراہن نوچ بھی نہیں سکتے
ہم جہاں نوردوں میں لاکھ عیب ہیں لیکن
گھر سے بے وفائی کا سوچ بھی نہیں سکتے

(اگست ۲۰۱۵)

رنگ شفق سے لے کر جیسے رُخ پہ مَلی ہے شام
اور نکھرتا جاتا ہے وہ جب سے ڈھلی ہے شام

دھوپ کنارہ زلفوں میں اور چاندنی گالوں پر
ایک افق پر چاند اور سورج! کیسی بھلی ہے شام

پت جھڑ جیسے رنگوں میں ہے جگنو جیسی آنچ
عمر کی جھکتی ٹہنی پر اک کِھلتی کلی ہے شام

رنگ فضا میں بکھرے ہیں اور شہنائی کی گونج
کس آنگن سے ہنستی روتی آج چلی ہے شام

سائے بھی آخر ڈھلتے ڈھلتے چھوڑ گئے ہیں ساتھ
رات سے کیسے اُلجھے آخر ، چھاؤں جلی ہے شام

فکرِ جہاں کی بستی میں پُر پیچ سڑک ہے د ن
رات ہے روشن دروازہ اور تیر ی گلی ہے شام

رات اُترنے والی ہے اب کوئی ٹھکانہ ڈھونڈ
اک دفعہ سر پر آکر کس کے سر سے ٹلی ہے شام

(۲۰۱۵)

روشنی ہی روشنی ہیں جس طرف سے دیکھئے
جل رہے ہیں جو چراغ اُن کو شرف سے دیکھئے

اِس طرح ہو جائے شاید دوست دشمن کی تمیز
اپنے لشکر کو کبھی دشمن کی صف سے دیکھئے

سازشوں کے سلسلے چارہ گری کے نام پر!
آج کے اِس دور تک عہدِ سلف سے دیکھئے

راہبر مشعل بکف ہے ، تیرگی کا خوف کیا
راستے کو موقفِ مشعل بکف سے دیکھئے

کیا تعلق دل کا ہوتا ہے نظر سے دوستو!
ناوکِ بے مہر کو آکر ہدف سے دیکھئے

تشنگی ہو جائے گی معلوم دریا کی ظہیرؔ
ابرِ نیساں کو ذرا چشمِ صدف سے دیکھئے

(۲۰۱۵)

آتشِ رنج و الم ، سیلِ بلا سامنے ہے
پیکرِ خاک میں ہونے کی سزا سامنے ہے

شعلۂ جاں ہے مرا اور ہوا سامنے ہے
زندگی جلوہ نما ہے کہ قضا سامنے ہے

ہر طرف ڈھونڈنے والو! اُسے دیکھو تو سہی
وہ کہیں اور نہیں ہے بخدا سامنے ہے

منعکس ہوں میں زمانے میں ، زمانہ مجھ میں
خود بھی آئینہ ہوں اور عکس نما سامنے ہے

لغزشِ پائے تمنا کا بھی امکان نہیں
جادۂ شوق میں گر اُس کی رضا سامنے ہے

کیا خبر کون سا جلوہ ہے پسِ پردۂ غیب
جس طرف دیکھئے اک راز نیا سامنے ہے

پھر وہی سوزِ دروں میرا ، وہی غفلتِ جاں
پھر وہی ساعتِ تجدیدِ وفا سامنے ہے

مجھے ناموسِ غمِ عشق ہے مانع ورنہ
چارہ گر بیٹھے ہیں پہلو میں ، دوا سامنے ہے

اپنے بارے میں نہ کھا عصمتِ یوسف کی قسم
پہلے یہ دیکھ تو لے چاکِ قبا سامنے ہے

اور کیا پیش کروں اپنی محبت کا ثبوت
میرے حالات کی صورت میں وفا سامنے ہے

ہم بھلا کون سے سقراطِ زماں ہیں جو ظہیرؔ
روز اک زہر بھرا جام نیا سامنے ہے

(مئی ۲۰۱۵)

آخر میں کھلا آ کر یہ راز کہانی کا
انجام سے ہوتا ہے آغاز کہانی کا

اس عہدِ تصنع کی ہر بات ہے پردوں میں
عنواں نہیں ہوتا اب غماز کہانی کا

تکرار بناتی ہے اب جھوٹ کو سچائی
تشہیر بدلتی ہے انداز کہانی کا

لے آتا ہے منظر پر، جب چاہے نیا کردار
رکھا ہے مصنف نے در باز کہانی کا

بننا ہی تھا آخر کو افسانۂ رسوائی
یاروں کو بنایا تھا ہمراز کہانی کا

مر کر بھی نہیں مرتے کردار محبت کے
رکھتا ہے انہیں زندہ اعجاز کہانی کا

افسانۂ ہستی میں وہ موڑ بھی آتا ہے
جب ساتھ نہیں دیتے الفاظ کہانی کا

(۲۰۱۶)

اِن غزالوں کو بھلا کس کے ٹھکانے کی خبر
پوچھیئے خارِ مغیلاں سے دِوانے کی خبر

خاک چھانوں تری گلیوں کی بتا میں کب تک
دے مرے شہر کوئی یار پرانے کی خبر!

اب خبر ملتی نہیں اُن کی زمانے میں کہیں
وہ جو رکھتے تھے کبھی سارے زمانے کی خبر

تیر ایسے بھی حلیفوں کی کمانوں میں ہیں آج
جن کے ترکش کا پتا ہے ، نہ نشانے کی خبر

ملنے آئے ہیں مرے دوست ، یقیناً ہوگی
پھر نئی تازہ کوئی دل کو جلانے کی خبر

باندھ لے زادِ سفر ، دیر نہ کر اب تو ظہیرؔ
آنے والی ہے کسی دن ترے جانے کی خبر

(۲۰۱۶)

چبھی ہے دل میں وہ نوکِ سنانِ وہم و گماں
ہوا ہے نقشِ سویدا نشانِ وہم و گماں

میں ایک سایۂ لرزاں ہوں ہست و نیست کے بیچ
مرا وجود ہے بارِ گرانِ وہم و گماں

نہ کھا فریب خریدارِ رنگ و بوئے چمن
محیطِ صحنِ چمن ہے دکانِ وہم و گماں

قدم قدم پہ ہے دامن کشاں یقینِ بہار
روش روش پہ ہویدا خزانِ وہم و گماں

وہ ایک لفظ حقیقت مدار ہے جس پر
لکھا ہوا ہے کہیں در بیانِ وہم و گماں

عیاں تھا عالمِ خواب و خیال میں کیا کیا
کھلی جو آنکھ تو سب داستانِ وہم و گماں

تمام حکمتیں باطل ہیں عشق کے آگے
تمام فلسفے سوداگرانِ وہم و گماں

بدونِ میرِ سفر ہیں جو رہروانِ ہدیٰ
بھٹک رہے ہیں پسِ کاروانِ وہم و گماں

مرے لہو میں جزیرہ تری محبت کا
یقین زارِ حقیقت میانِ وہم و گماں!

نویدِ عالمِ امکان ہے خیال ترا
سمٹ رہا ہے مسلسل جہانِ وہم و گماں

ظہیرؔ ناوکِ بے زور ہے سخن بھی ترا
گرفتِ فکر بھی جیسے کمانِ وہم و گماں

(مئی ۲۰۱۶)

قریۂ سیم و زر و نام و نسب یاد آیا
پھر مجھے ترکِ تعلق کا سبب یاد آیا

ہجر میں بھول گئے یہ بھی کہ بچھڑے تھے کبھی
دور وہ دل سے ہوا کب ، ہمیں کب یاد آیا

کارِ بیکار جسے یاد کہا جاتا ہے
بات بے بات یہی کارِ عجب یاد آیا

-ق-

پارۂ ابر ہٹا سینۂ مہتاب سے جب
عشوۂ ناز سرِ خلوتِ شب یاد آیا

عارضِ شب ہوئے گلنار ، صبا شرمائی
جب ترا غمزۂ غمازِ طلب یاد آیا

پھر مری توبۂ لرزاں پہ قیامت گزری
پھر مجھے رقصِ شبِ بنتِ عنب یاد آیا

یاد آئے ترے کم ظرف بہکنے والے
جامِ کم کیف بصد شور و شغب یاد آیا

-

چاندنی ، جھیل ، ہوا ، زلفِ پریشاں ، بادل
دل و جاں ہم نے کہاں کھوئے تھے اب یاد آیا

کیا لکھے کوئی بجز نوحۂ قرطاس کہ حیف
بے ادب خامۂ ارزاں کو ادب یاد آیا

(۲۰۱۶)

میں اشکبار ہوں ناممکنہ کی خواہش میں
نمک مثال گھلے جارہا ہوں بارش میں

دیا ہے میں نے ہی دشمن کو وار کا موقع
مرا بھی ہاتھ ہے اپنے خلاف سازش میں

خمارِ شام ، غمِ تیرگی ، امیدِ سحر
عجیب عکس ہیں بجھتے دیئے کی تابش میں

بجا ہے طعنۂ باطل مری دلیلوں پر
ہزار جہل بھی شامل ہیں میری دانش میں

یہ جبرِ راہ گزر ہے ، سفر نہیں میرا
کہ دل شریک نہیں منزلوں کی کاوش میں

وہ عکس ہوں جو کسی آنکھ سے بچھڑ کے ظہیرؔ
بھٹک رہا ہے وصالِ نظر کی خواہش میں

(۲۰۱۶)

گھر بسانے کی تمنا کوچۂ قاتل میں ہے
زندگی مصروف اک تحصیلِ لاحاصل میں ہے

شورِ طوفاں قلقلِ مینا ہے پیاسوں کے لئے
اک پیالے کی طرح ساگر کفِ ساحل میں ہے

چاک کو دیتے ہیں گردش دیکھ کر گِل کا خمیر
اک پرانی رسم ہم کوزہ گرانِ گِل میں ہے

مرکزِ دل سے گریزاں ہے محیطِ روزگار
دائرہ کیسے بنے ، پرکارِ جاں مشکل میں ہے

دے گیا ہے ڈوبتا سورج اُجالے کی نوید
ایک تازہ دن کہیں تقویم کی منزل میں ہے

عیب اُنھی کی آنکھ میں ہو عین ممکن ہے ظہیرؔ
جو سمجھتے ہیں کہ خامی جوہرِ کامل میں ہے

(۲۰۱۶)

قطعہ

وہاں اک موجِ بے حس ہے کہ آنکھیں نم نہیں کرتی
یہاں آبِ ندامت میں جبینیں ڈوب جاتی ہیں
یہ موجِ بے حسی بن کر سُونامی جان لے لے گی
سفینے برطرف اِس میں زمینیں ڈوب جاتی ہیں

(۲۰۱۸)

ہواؤں کی زد پہ دیا زندگی کا!
وطیرہ یہ ہم نے رکھا زندگی کا

عدم سے ملا ہے سرا زندگی کا
مکمل ہوا دائرہ زندگی کا

یہ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں پھر
جب آگے سے پردہ ہٹا زندگی کا

ستم بھی دکھائے سبھی تیرے غم نے
سلیقہ بھی مجھ کو دیا زندگی کا

خبر کوئی کردے دلِ بے خبر کو
قضا پوچھتی ہے پتہ زندگی کا

کیا زندگی نے اُنہیں بے دم آخر
جو دم بھر رہے تھے بڑا زندگی کا

وجود آدمی ہے ، تو ہے زندگی عکس!
کرے آدمی کیوں گلہ زندگی کا

بھرے پھول جتنے ظہیرؔ اُس قدر ہی
یہ دامن کشادہ ہوا زندگی کا

(۲۰۱۸)

سخن رہے گا ، سخنور بھی کم نہیں ہونگے
یہ اور بات ہے کاغذ قلم نہیں ہونگے

ملے گا شورِ ستائش تو شعر خوانوں کو
سخن شناس کنائے بہم نہیں ہونگے

جو چل بھی جائے نظر پر طلسمِ نقش و نگار
حروفِ خام تو دل پر رقم نہیں ہونگے

مذاقِ شعر بدل دے گا جب مزاجِ ہنر
خدا کا شکر ہے اُس وقت ہم نہیں ہونگے

ہمارے درد الگ ہیں ، ہمارا لہجہ الگ
کبھی بھی شورِ زمانہ میں ضم نہیں ہونگے

ہمارے سینے میں ٹوٹی ہے آ کے تیغِ ستم
ہمارے بعد کسی پر ستم نہیں ہونگے

جنہیں شناخت ہماری ہی دشمنی سے ملی
رہیں گے وہ بھی نہ باقی جو ہم نہیں ہونگے

تمہارا ہجر سلامت ، تمہارے غم آباد!
کبھی اکیلے خدا کی قسم نہیں ہونگے

یہ سوچ کر میں غموں میں بھی شاد رہتا ہوں
وہ دن بھی آئیں گے رنج و الم نہیں ہونگے

عجیب راہ چلا ہوں دیارِ غربت میں
گزر گیا بھی تو نقشِ قدم نہیں ہونگے

ملا ہے کاسۂ خوددار اُس کے در سے ظہیرؔ
تمام عمر تہی دست ہم نہیں ہونگے

(۲۰۱۷)

اک جہانِ رنگ و بو اعزاز میں رکھا گیا
خاک تھا میں ، پھول کے انداز میں رکھا گیا

حیثیت اُس خاک کی مت پوچھئے جس کے لئے
خاکدانِ سیم و زر آغاز میں رکھا گیا

-ق-

اک صلائے عام تھی دنیا مگر میرے لئے
اک تکلف دعوتِ شیراز میں رکھا گیا

ایک خوابِ آسماں دے کر میانِ آب و گِل
بال و پر بستہ مجھے پرواز میں رکھا گیا

بربطِ منظر پہ رکھ کر شرطِ مضرابِ نظر
نغمہائے بے صدا کو ساز میں رکھا گیا

ایک خوئے جستجو دی ، ایک دستِ ممکنات!
زندگی کو آدمی سے راز میں رکھا گیا

-

کھا رہا ہے تیرگی سے بس لڑائی کا فریب
وہ دیا جو حجرۂ در باز میں رکھا گیا

اک جہانِ حرف کتنی بار ٹوٹا اور بنا
تب کہیں احساس کو الفاظ میں رکھا گیا

بن گئی میرا تشخص میری خاموشی ظہیرؔ
درد کچھ ایسا مری آواز میں رکھا گیا

(۲۰۱۷)

وہ کلاہِ کج ، وہ قبائے زر ، سبھی کچھ اُتار چلا گیا
ترے در سے آئی صدا مجھے ، میں دِوانہ وار چلا گیا

کسے ہوش تھا کہ رفو کرے یہ دریدہ دامنِ آرزو
میں پہن کے جامۂ بیخودی سرِ کوئے یار چلا گیا

مری تیزگامئ شوق نے وہ اُڑائی گرد کہ راستہ
جو کھلا تھا میری نگاہ پر وہ پسِ غبار چلا گیا

نہ غرورِ عالمِ آگہی ، نہ جنون و جذبۂ بیخودی
مئے عشقِ خانہ خراب کا ہر اک اعتبار چلا گیا

تری کائناتِ جمال میں جو عطائے دستِ مجال تھا
مرے شوقِ افسوں طراز کا وہی اختیار چلا گیا

میں ادا کروں کہ قضا کروں ، اسی کشمکش میں بسر ہوئی
یونہی سجدہ گاہِ حیات سے میں گناہگار چلا گیا

ترے آستاں سے گلہ نہیں ، دلِ سوختہ ہی عجیب ہے
کبھی بے سکون ٹھہر گیا ، کبھی بے قرار چلا گیا

تری جلوہ گاہِ نیاز میں ، ہے کوئی تماشئہ آرزو!
کبھی تابِ دید نہ آسکی ،کبھی انتظار چلا گیا

مجھے کاروبارِ وفا ملا ، وہ متاعِ صبر و غنا ملی
مرے دن ظہیرؔ بدل گئے ، غمِ روزگار چلا گیا

(۲۰۱۷)

نہ وہ ملول ہوئے ہیں ، نہ ہم اداس ہوئے
مزاج ترکِ تعلق پہ بے لباس ہوئے

بجھائے ایسے ہوا نے چراغِ خوش نظری
فروغِ دید کے موسم بھی محوِ یاس ہوئے

ہم اعتراض تھے ناقد مرے قصیدوں پر
جمالِ یار کو دیکھا تو ہم سپاس ہوئے

مری نظر میں خود اپنے ہی نقطہ ہائے نظر
نہیں جو تیرا حوالہ تو بے اساس ہوئے

یہ کار ہائے محبت بپاسِ خاطرِ عشق
دیارِ ہجر میں ہم سے بطورِ خاص ہوئے

یہ شہر جاں ہے سلامت کسی کے ہونے سے
ہزاروں حادثے ورنہ تو دل کے پاس ہوئے

سحر ہوئی تو رفیقانِ بے خبر ، میرے
چراغِ کشتۂ ظلمت سے روشناس ہوئے

دکھائے گردشِ ایام نے وہ رنگ اس بار
ہم ایسے کافر و منکر خدا شناس ہوئے

ہمارا عہدِ مسائل رقم ہے غزلوں میں
ہمارے شعر زمانے کا اقتباس ہوئے

سخن جو عام سے لگتے تھے ساری دنیا کو
ظہیرؔ حلقۂ یاراں میں آکے خاص ہوئے

(۲۰۱۸)

دیارِ شوق کے سب منظروں سے اونچا ہے
یہ سنگِ در ترا سارے گھروں سے اونچا ہے

مقامِ عجز کو بخشی گئی ہے رفعتِ خاص
جو سر خمیدہ ہے وہ ہمسروں سے اونچا ہے

فرازِ طور کی خواہش نہ کر ابھی اے عشق!
یہ آسمان ابھی تیرے پروں سے اونچا ہے

خدا مدد! کہ یہ شیطانِ نفسِ امّارہ
مرے اُچھالے ہوئے کنکروں سے اونچا ہے

فریبِ قامتِ رہبر نہ کھاؤ ہمسفرو!
وہ دیکھو قدِ علَم رہبروں سے اونچا ہے

یہ اشکِ ہجر تو سیلاب بن گیا ہے ظہیرؔ
جدھر بھی دیکھئے پانی سروں سے اونچا ہے

(جون۲۰۱۸)

چراغِ شام جلا ہے کہ دل جلا کوئی
حصارِ ضبطِ فغاں سے نکل چلا کوئی

نہ کوئے یار میں آوارہ کوئی دیوانہ
نہ بزمِ یار میں باقی ہے منچلا کوئی

بدل گیا ہے سراسر مزاجِ اہلِ جنوں
نہ شوقِ مرگ نہ جینے کا ولولہ کوئی

سلامت آگئے مقتل سے غازیانِ عشق
نہ سر گرے ہیں نہ خیمہ کہیں جلا کوئی

عجیب راہیِ حق ہیں وہ جن کی راہوں میں
کوئی دمشق ، نہ کوفہ ، نہ کربلا کوئی

وہی تو جادۂ منزل ہے رہروانِ وفا
وہ رہگزار کہ جس پر نہیں چلا کوئی

فدائیانِ محبت کی بیعتیں ہیں الگ
امیرِ شہر سے کہہ دے یہ برملا کوئی

مآلِ کلمۂ حق سے ظہیرؔ ڈر کیسا
صلیب و دار پہ مرتا بھی ہے بھلا کوئی

(۲۰۱۸)

اُجلی ردائے عکس کو میلا کہیں گے لوگ
آئینہ مت دکھایئے ، جھوٹا کہیں گے لوگ

شاخیں گرا رہے ہیں مگر سوچتے نہیں
پھر کس شجر کی چھاؤں کو سایہ کہیں گے لوگ

واقف ہیں رہبروں سے یہ عادی سراب کے
دریا دکھایئے گا تو صحرا کہیں گے لوگ

شہرت کی روشنی میں مسلسل اُچھالئے
پتھر کو آسمان کا تارا کہیں گے لوگ

آغازِ داستاں ہے ذرا سنتے جایئے
آگے تو دیکھئے ابھی کیا کیا کہیں گے لوگ

جو کچھ برائے زیبِ بیاں کہہ رہے ہو آج
کل اُس کو داستان کا حصہ کہیں گے لوگ

لوگوں کو اختیار میں حصہ تو دیجئے
اربابِ اختیار کو اپنا کہیں گے لوگ

فردِ عمل پہ کر کے رقم اپنے فیصلے
اپنے لکھے کو بخت کا لکھا کہیں گے لوگ

شکوہ کرو نہ دیدۂ ظاہر پرست کا
جیسے دکھائی دیتے ہو ویسا کہیں گے لوگ

کس شہرِخود فریب میں جیتے ہو تم ظہیرؔ
اپنا سمجھ رہے ہیں نہ اپنا کہیں گے لوگ

(۲۰۱۷)

یقینِ نور ہو دل میں تو شب گوارا ہے
سحر نے رات کے اُس پار سے پکارا ہے

نہ کھاؤ خوف طلسماتِ منظرِ شب سے
فریبِ شعلۂ ظلمت ہے جو نظارہ ہے

بندھا ہوا ہے نگاہوں سے مہرِ تاباں تک
چلے چلو کہ یہ تارِ نظر سہارا ہے

ابھی سے شکوۂ ایامِ رفتہ چہ معنی!
ابھی تو رات ہماری ہے دن ہمارا ہے

دھڑک بھی جائے تو چنگاریاں سی اٹھتی ہیں
یہ دل نہیں مرے سینے میں سنگِ خارا ہے

ہجومِ کارِ مسلسل نے کردیا تنہا
مری کمائی منافع نہیں خسارہ ہے

نہ فکرِ سود و زیاں ہے نہ غم تمہارا ہے
یہ وقت نے مجھے کس راہ سے گزارا ہے

نگارخانۂ ہستی کے کینوس تھے سفید
تمہارے درد کی تصویر سے نکھارا ہے

وہ ایک نقشِ فسوں گر جسے وفا کہیے
بصد ہزار سلیقہ اُسے سنوارا ہے

رکھا ہوا ہے جو سینے پر ایک سنگِ گراں
کسی کی پلکوں سے ٹوٹا ہوا ستارہ ہے

غزل میں حدِ ادب ہے بیانِ راز و نیاز
یہاں شگفتنِ غنچہ بھی استعارہ ہے

امان عزیز ہے میری طرح سے اُس کو بھی
ہمارے بیچ میں دریا نہیں کنارہ ہے

(۲۰۱۹)

کوئی فخرِ زہد و تقویٰ ، نہ غرورِ پارسائی
مجھے سب خبر ہے کیا ہے مرے نفس کی کمائی

مجھے جب کبھی اندھیرے ملے راہِ جستجو میں
نئی مشعلِ تمنا ترے نام کی جلائی

اسے کیوں نہ سر پہ رکھوں ، یہ جزائے بندگی ہے
ترے نام سے مزیّن مرا کاسۂ گدائی

وہ جو ضبط سے نہ نکلا ، کبھی نطق تک نہ پہنچا
اُسی حرفِ نارسا کی ہوئی عرش تک رسائی

ہے مرا وجود ثابت ، ہے مرا شمار ممکن
مرے صفر سے ہے پہلے تری ذات کی اکائی

نہ جھکا سکے جو سر کو وہ عمامۂ فضیلت
سرِ بزمِ علم و دانش ہے کلاہِ خود نمائی

مرے چارہ گر سے کہہ دو یہ مرض ہے آگہی کا
نہ کرے گی کام اِس میں کوئی نیند کی دوائی

مری چشمِ خوش گماں تُو مری دوست ہے کہ دشمن
تو نے خواب ایسے دیکھے مجھے نیند ہی نہ آئی

ہیں بجھے بجھے سے دونوں، سبھی رونقوں سے خالی
مری بزمِ ترکِ الفت، ترا جشنِ بے وفائی

کہیں لے گئیں ہوائیں وہ محبتوں کے فانوس
شب و روز بجھ رہے ہیں مہ و سالِ آشنائی

(۲۰۱۹)

دل میں اب کوئی ترے بعد نہیں آئے گا
سنگِ ارزاں تہِ بنیاد نہیں آئے گا

دن نکلتے ہی بھلادوں گا میں اندیشۂ روز
سرحدِ صبح میں شب زاد نہیں آئے گا

ایسے اک طاقِ تمنا پہ رکھ آیا ہوں چراغ
بجھ گیا بھی تو مجھے یاد نہیں آئے گا

حسنِ خود دار کو اِس دورِ خود آرا میں بہم
ہنرِ مانی و بہزاد نہیں آئے گا

طوقِ زرناب ہوئے زیبِ گلوئے گفتار
اب کہیں سے سخن آزاد نہیں آئے گا

فرقِ زندان و گلستان بھی سب دیکھ لیا
لب پراب شکوۂ صیاد نہیں آئے گا

کھوج کس کی ہے تمھیں راہ نوردانِ فراق
اب کوئی قریۂ آباد نہیں آئے گا

عشرتِ سایۂ دیوار کی چالوں میں دگر
پائے درماندۂ افتاد نہیں آئے گا

اب کسی شعبدہ گر دامِ عنایت میں ظہیرؔ
یہ دلِ خوگرِ بیداد نہیں آئے گا

(۲۰۱۹)

آنکھوں میں ہوں سراب تو کیا کیا دکھائی دے
پانی کے درمیان بھی صحرا دکھائی دے

بینائی رکھ کے دیکھ مری ، اپنی آنکھ میں
شاید تجھے بھی درد کی دنیا دکھائی دے

دنیا نہیں نمائشِ میکانیات ہے
ہر آدمی مشین کا پرزہ دکھائی دے

آدم غبارِ وقت میں شاید بکھر گیا
حوّا زمینِ رزق پہ تنہا دکھائی دے

۔ق۔

جس انقلابِ نور کا چرچا ہے شہر میں
مجھ کو تو وہ بھی رات کا حربہ دکھائی دے

نکلو تو ہر گلی میں اندھیرے کا راج ہے
دیکھو تو کچھ گھروں میں اُجالا دکھائی دے

شطرنج ہے سیاستِ دوراں کا کھیل بھی
حاکم بھی اپنے تخت پہ مہرہ دکھائی دے

مجھ کو درونِ ذات کا نقشہ دکھائی دے
آئینہ وہ دکھاؤ کہ چہرہ دکھائی دے

آدابِ تشنگی نے سکھائے ہیں وہ ہنر
پیاسے کو مشتِ خاک میں کوزہ دکھائی دے

ایسی رہی ہیں نسبتیں دیوارِ یار سے
کوئے ستم کی دھوپ بھی سایا دکھائی دے

ہر لب پہ حرفِ وعظ و نصیحت ہے شہر میں
ہر شخص آسمان سے اُترا دکھائی دے

افشاں کسی کسی میں ہی انوارِ فیض ہے
ویسے تو ہرچراغ ہی جلتا دکھائی دے

اُن کے ورق ورق پہ ہے نامِ خدا رقم
جن کی کتابِ زندگی سادہ دکھائی دے

تمثیل گاہِ وقت میں بیٹھے ہیں منتظر
پردہ اُٹھے تو کوئی تماشا دکھائی دے

دنیا فریب زارِ نظر ہے عجب ظہیرؔ
آنکھیں نہ ہوں تو خاک بھی سونا دکھائی دے

(۲۰۱۹)

وہ ایک شخص دو عالم کی سروری والا
شعور دے گیا شاہوں کو سادگی والا

ہزاروں چاند ستارے وہ کرگیا روشن
وہ اک چراغ تھا سورج کی روشنی والا

وہ مُہرِ ختمِ نبوت ، وہ حرفِ آخرِ حق
وہ اک رسول رسولوں میں آخری والا

قریبِ عرش خدا سے وہ محوِ راز و نیاز!
زمیں پہ نقشِ اطاعت وہ بندگی والا

نگار خانۂ سیرت کا شاہکارِ ہے وہ!
وہ نقشِ خاص خدا کی مصوری والا

کھڑا ہے راہِ خدا میں وہ خلق سے آگے
علَم اٹھائے ہوئے شانِ رہبری والا

ہر ایک چشمۂ عرفاں اُسی سے نکلا ہے
وہی ہے منبعِ اعجاز آگہی والا

شعار اُس کا ہے معراجِ خُلقِ نوعِ بشر
سلوک اُس کا ہے تکریمِ آدمی والا

شعاعِ نورِ ہدایت ہے اُس کی ہر تعلیم
دلوں سے داغ مٹاتی ہے تیرگی والا

وہ بدنصیب جو منکر ہیں اُس کی سنّت کے
مزاج رکھتے ہیں خواہش کی پیروی والا

کٹاؤ گردنِ پندار اُس کے لفظوں پر
پیامِ احمدِ مرسل ہے زندگی والا

مرا امام ہے لوگو وہ انبیاء کا امام
زمانے بھر میں نہیں جس کی ہمسری والا

۔ق۔

عدن بنا گیا مسجد کو اپنے سجدوں سے
مکینِ خاص مدینے کی اک گلی والا

بڑے ادب سے اُس اُمّی لقب کے قدموں میں
قلم بھی رکھتا ہے قرطاس عاجزی والا

سخن تو حسبِ مراتب نہیں ظہیرؔ کے پاس
درودِ سادہ ہے لیکن یہ شاعری والا

الٰہی جب بھی فرشتے پڑھیں صلوٰۃ و سلام
مرا سلام بھی پہنچے یہ بے بسی والا

بنادے میرا ٹھکانا بھی اِس کی مٹی میں
نبی کے شہر میں آیا ہے بے گھری والا

(۲۰۱۹)

واعظ نے اپنے زورِ بیاں سے بدل دیا
کتنی حقیقتوں کو گماں سے بدل دیا

ہونا تھا میرا واقعہ آغاز جس جگہ
قصّےکو قصّہ خواں نے وہاں سے بدل دیا

ہے شرطِ جوئے شیر وہی ، وقت نے مگر
تیشے کو جیسے کوہِ گراں سے بدل دیا

اب مل بھی جائیں یار پرانے تو کیا خبر
کس کس کو زندگی نے کہاں سے بدل دیا

بیدادِ عشق ہے کہ یہ آزارِ آگہی
سینے میں دل کو دردِ نہاں سے بدل دیا

اس بار دشتِ جاں سے یوں گزری ہوائے درد
موجِ لہو کو ریگِ رواں سے بدل دیا

آنکھوں میں شامِ ہجر کا ہر عکسِ منجمد
مل کر کسی نے اشکِ رواں سے بدل دیا

احساسِ رائگانیِ جذبِ دروں نہ پوچھ
میں نے سکوتِ غم کو فغاں سے بدل دیا

(۲۰۱۹)

اپنے ہر درد کا درمان بنائے رکھا
غم اک ایسا تھا کہ سینے سے لگائے رکھا

پاسِ ناموسِ مسیحا تھا مجھے درپردہ
زخمِ جاں سوز کو مرہم سے بچائے رکھا

ایک اندیشۂ ناقدریِ عالَم نے مجھے
عمر بھر چشمِ زمانہ سے چھپائے رکھا

کبھی جانے نہ دیا گھر کا اندھیرا باہر
اک دیا میں نے دریچے میں جلائے رکھا

دیکھ کر برہنہ پا راہ کے کانٹوں نے مجھے
رشکِ گلشن مرے رستے کو بنائے رکھا

اصل کردار تماشے کے وہی لوگ تو تھے
وقت نے جن کو تماشائی بنائے رکھا

دیکھ سکتا تھا بہت دور تک آگے میں ظہیرؔ
جب تک اِن شانوں پہ بچوں کو اٹھائے رکھا

(۲۰۱۹)

عشق پھر سے مجھے نیا کر دے
ہر بھرے زخم کو ہرا کر دے

آسرا چھین لے مسیحا کا
مجھے مرہم سے ماورا کر دے

زہر بننے لگا ہے سناٹا
شور مجھ میں کوئی بپا کر دے

میں اک آشوبِ اعتبار میں ہوں
اپنی آنکھیں مجھے عطا کر دے

ترے رستے میں ہم سفر کیسا
مجھے سائے سے بھی جدا کر دے

میں مکمل بھی ہو ہی جائوں گا
تو کسی روز ابتدا کر دے

جذبۂ شوق! انتہا کر دے
ہر تمنا کو بے صدا کر دے

قید اپنی انا کے بُت میں ہوں
کوئی توڑے مجھے رہا کر دے

عمر گزری مری کٹہرے میں
زندگی اب تو فیصلہ کر دے

قد گھٹا دے مری نظر میں مرا
یاالٰہی مجھے بڑا کر دے

فخر کرتی ہے آدمی پہ حیات
جب کسی کا کوئی بھلا کر دے

میرے سر پر نہیں رہے ماں باپ
کوئی میرے لئے دعا کر دے

ہے مبارک وہ سانحہ جو ظہیؔر
بے نواؤں کو ہم نوا کر دے

(۲۰۲۰)

متفرق اشعار

اک بات کہہ رہے ہیں شاعر سبھی غزل کے
اک شعر ہورہا ہے مصرعے بدل بدل کے

مجھ کو شریکِ غم بنا ، اپنا شریکِ حال رکھ
اتنا بھی خود غرض نہ بن ، کچھ تو مرا خیال رکھ

توفیقِ دعا دے تو اثر ساتھ میں دینا
دربازیِ بخشش کی خبر ساتھ میں دینا

ہر تہمتِ غرور و تکبر سے پاک ہیں
ہم اہلِ انکسار کے قدموں کی خاک ہیں

اس بے کل دل کی دھڑکن سے چاہت کا اک تار بندھا ہے
تار بھی کیسا انہونا جو ساگر کے اُس پار بندھا ہے

اک شخص جو گزرا ہوا قصہ ہے زندگی کا
اب کیا کہیں کہ آج بھی حصہ ہے زندگی کا

کاش ایسا ہو کوئی بات ضروری رہ جائے
آج پھر اُن سے ملاقات ادھوری رہ جائے

بولوں تو ساری دنیا اُسے جان جائے گی
اور چپ رہوں تو پھر مری پہچان جائے گی

مال و متاعِ درد میں سمجھو نہ کم ہمیں
میراث میں ملے ہیں یہ نسلوں کے غم ہمیں

ہم سے بڑھ کر تو کوئی خاک میں کھویا بھی نہ تھا
پھر بھی وہ کاٹ رہے ہیں کہ جو بویا بھی نہ تھا

رستے طویل ہو گئے یا گھٹ گیا ہے دن
اب تک سفر نہیں کٹا اور کٹ گیا ہے دن

میں کہیں ، یاد کہیں ، خواب کہیں ہے میرا
جو نظر آتا ہے میرا ، وہ نہیں ہے میرا

نظر میں روشنی رکھنا کسی حوالے کی
چراغِ راہ ضمانت نہیں اجالے کی

کبھی آنکھوں سے کوئی خواب بچھڑ جاتا ہے
صبح کی آس میں مہتاب بچھڑ جاتا ہے

اب کوئی در ، نہ کوئی راہ گزر دیکھوں گا
ویسے ممکن تو نہیں پھر بھی میں کر دیکھوں گا

شب سرائے میں پہنچ کر مجھے رخصت دے گا
پھر وہی کام سویرے جو مسافت دے گا

ہر سفر اب مجھے ہجرت کا سفر لگتا ہے
گھر کو جاتے ہوئے رستے سے بھی ڈر لگتا ہے

اب تو یہ فیصلہ ہوجائے کدھر جانا ہے
ابھی رستوں میں بھٹکنا ہے کہ گھر جانا ہے
غمِ دوراں سے رہا ہو کے کدھر جانا ہے
اسی زنداں میں ہمیں جینا ہے مرجانا ہے

سنا ہے پھر سے محبت کے امتحاں ہونگے
جو داغ مٹ گئے دل کے وہ پھر عیاں ہونگے

تمہاری زلف کے سائے میں چاند رات کریں
ہماری عید یہی ہے کہ تم سے بات کریں
تمہارے شوخ لبوں سے چرا کے شرماہٹ
گلاب و لالۂ و سنبل کے رنگ مات کریں

گزر رہی ہے تری یاد کی حضوری میں
نشاطِ قرب میسر ہے اتنی دوری میں

دل جہاں کھویا ، وہیں پندارِ غم بھی کھودیا
برسوں بعد اُس سے ملا تو مل کے میں بھی رو دیا

تلاشِ ذات کی منزل تو اک ٹھکانہ ہے
سفر کے بعد مجھے لوٹ کر بھی آنا ہے

(ختم شد)

تعارف

نام: ظہیر الدین شیخ۔ (قلمی نام ظہیرؔ احمد)

تاریخ پیدائش: ۱۸ جنوری ۱۹۶۲ء۔ حیدرآباد (سندھ)

ابتدائی تعلیم: نور محمد ہائی اسکول اور گورنمنٹ سائنس کالج کالیموری۔ حیدرآباد

میڈیکل تعلیم: لیاقت میڈیکل کالج۔ جامشورو (سندھ)

اعلیٰ طبی تعلیم: ریاستہائے متحدہ امریکا

رہائش: وسکانسن (امریکا)

رابطہ: بذریعہ اردو محفل (اردوویب ڈاٹ کام)